ناصرِ کاظمی شخصیت اور فن

ناہید قاسمی

ناصر کاظمی شخصیت اور فن

ناہید قاسمی

فضل حق اینڈ سنز پبلشرز لاہور

جملہ حقوق محفوظ

پہلی بار : ـــــــ نومبر ۱۹۹۰ء

تعداد : ۵۰۰

ناشر : ـــــــ طلعت حق خان

قیمت : ـــــــ/۸۵ روپے

مقامِ اشاعت : ـــــــ فضل حق اینڈ سنز

پبلشرز اینڈ پرنٹرز،

دربار مارکیٹ لاہور۔

انتساب

اپنے پیارے ابا جی اور اپنی پیاری امی جی کے نام
جن کی دعاؤں کی روشنی میں مجھے لفظ لکھنا سیکھنے
کی سعادت نصیب ہوئی۔

؎ بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من

فہرست

۱ — پہلی بات		۶
۲ — پہلا باب	حالاتِ زندگی اور شخصیت	۹
۳ — دوسرا باب	اُردو غزل - قیامِ پاکستان تک	۶۰
۴ — تیسرا باب	غزل کی حیاتِ نو - اور ناصر کاظمی	۹۱
۵ — چوتھا باب	ناصر کی غزل کے اہم پہلو	۱۲۵
۶ — پانچواں باب	ناصر کی نظم اور نثر کا جائزہ	۱۷۳
	و — نظم	
	ب — نثر	
۷ — چھٹا باب	"ہر دور کی غزل میں میرا نشاں ملے گا"	۲۲۰
۸ — کتب و رسائل کی فہرست		۲۳۶

پہلی بات

خودستائی کے الزام کا خطرہ مول لے کر بھی میں اس مقالے کے حوالے سے یہ بتانا اپنا حق اور فخر سمجھتی ہوں کہ میں احمد ندیم قاسمی کی بیٹی ہوں۔ یوں گھر میں بھی مجھے شعروادب کا ستھرا ماحول میسّر آیا اور اپنے اس مقالے کو تکمیل کے مراحل تک پہنچانے کے لئے بھی اپنے آباجی کے توسط سے مجھے ناصر کاظمی کے گھر کے علاوہ ان کی غیر مطبوعہ اور نادر تحریروں[1] تک بھی رسائی حاصل ہوئی۔ ساتھ ہی یہ وضاحت بھی شاید بیکار نہ ہو گی کہ میں خود بھی ایک چھوٹی سی.... بالکل چھوٹی سی شاعرہ ہوں۔ بی۔ اے تک میں نے اُردو ادب کے ساتھ فائن آرٹس کا مضمون لے رکھا تھا مگر ایم۔ اے اُردو میں داخلہ یہ سوچ کر لیا کہ اگر میرے اندر شاعری کا جوہر واقعی موجود ہے تو اس طرح اُسے نکھرنے کا موقع ملے گا اور حق بات یہ ہے کہ ناصر کے فن اور شخصیت پر یہ تحقیقی مقالہ لکھ کر میں اپنے اندر ایک روشنی سی محسوس کرتی ہوں۔

میں نے ناصر کاظمی کی غزلیں پہلے بھی کئی بار پڑھی تھیں اور آباجی سے ان کے فن اور شخصیت کے بارے میں کئی باتیں بھی سُنی تھیں لیکن یہ بات میرے وہم و گمان

---

[1] جو اس دوران میں بیشتر شائع ہو چکی ہیں۔

میں بھی نہ تھی کہ ایک روز مجھے ناصر کاظمی کے سے شاعر پر مقالہ لکھنے کا اعزاز حاصل ہوگا۔
چنانچہ جب یہ خوشگوار کام میرے سپرد ہوا تو میں نے اس وقت تہیہ کر لیا کہ میں محنت اور ریاضت کی انتہا کر دوں گی اور میرے اندر فن سے جتنی بھی لگن ہے اسے یہ مقالہ لکھنے کے کام میں لاؤں گی۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے تو میں نے ناصر کے کلام سے دوستی بڑھائی۔ یوں آہستہ آہستہ ان کا کلام میرے احساس، جذبات اور فکر پر ساون کی نرم پھوار کی طرح برستا اور جذب ہوتا رہا، اور میں نے قلم اس وقت اٹھایا جب میں نے ان کی شخصیت اور فن کو ممکن حد تک جان لیا۔ اب یہ فیصلہ کرنا میرا کام نہیں ہے کہ میں اس جان پہچان میں کتنی کامیاب رہی ہوں۔

اس مقالے کے لئے میرے نگران استادِ مکرّم سید سجّاد باقر رضوی صاحب ہیں جو ناصر کے قریبی دوستوں میں سے ہیں۔ ناصر کے بارے میں ان سے باتیں کرتے ہوئے میں نے ناصر کو ہمیشہ جیتا جاگتا محسوس کیا۔ سجاد صاحب نے جو توجہ مجھے دی اور جو محنت مجھ پر کی اس کا شکریہ تو شاید میں مناسب الفاظ میں ادا کر سکنے کے قابل ہو ہی نہیں سکتی لیکن میں ان کی اس عنایت کو کبھی فراموش نہیں کر سکوں گی کہ ناصر کے سلسلے میں ان کی اور میری سوچ میں کئی بار اور کئی مقام پر اختلاف بھی ہوا، جو اَب بھی ہے لیکن انہوں نے کسی بھی لمحے اپنی رائے مجھ پر مسلط نہ کی بلکہ جب میں نے اپنی بات کہی تو انہوں نے میرا حوصلہ بڑھایا۔ میرے خیال میں یہ میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے ایسے شفیق نگران ملے جنہوں نے مجھے اتنی آزادی دی کہ میں خود راہیں ڈھونڈ کر منزل تک پہنچوں، نہ کہ وہ ہمیشہ، ہر لمحے میری انگلی ہی تھامے رہیں۔ میرے ابا جی نے مجھے شعر و ادب کے سلسلے میں جو آزادی دے رکھی تھی وہ میرے محترم نگران کے تعاون سے میری خود اعتمادی میں بدل گئی۔

میں بیگم ناصر کاظمی اور ان کے دونوں صاحبزادوں باصر سلطان کاظمی اور حسن سلطان

کاظمی کی بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ہمیشہ نہایت خندہ پیشانی سے میری دستگیری کی اور ناصر کی بہت سی غیر مطبوعہ تحریریں مجھے دکھائیں اور ناصر کے انتہائی اہم ٹی۔ وی انٹرویو کی نقل بھی مجھے دی۔ میں ناصر کاظمی کے احباب کی بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے میرے خطوط کے جواب بھی لکھے اور ملاقات کے لئے قیمتی وقت بھی دیا۔ یہاں میں اپنے ایک اور محترم استاد کا بھی شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ یہ محترم ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی صاحب ہیں جنہوں نے مقالے کی تیاری کے دوران میں مجھے ذرا سا بھی سست ہوتے دیکھا تو فوراً خبر دار کیا اور بہت شفقت سے میرے مقالے کی کامیابی کی دعا کی۔ سچی بات یہ ہے کہ اپنے شوق کے علاوہ سجاد صاحب، صدیقی صاحب، اباجی اور خود ناصر کاظمی کے لئے بھی میں نے اس مقالے کو ہر پہلو سے مکمل کرنے کی سعی کی اور یہ مقالہ اس احساس کے ساتھ لکھا کہ ناصر پر مستقبل میں چاہے جو کچھ بھی لکھا جائے لیکن اس موضوع پر "حرفِ آغاز" کا اعزاز میرے ہی حصے میں آیا۔

ستمبر ۱۹۷۴ء

ناہید قاسمی

یونیورسٹی اورنٹیل کالج، لاہور

پہلا باب

حالاتِ زندگی اور شخصیّت

اکثر کہا جاتا ہے کہ شاعر فطرتاً شاعر ہی ہوتا ہے، یعنی فنِ شاعری سیکھنے سے عام آدمی شاعر نہیں بن سکتا۔ یہ بات تو درست ہے کہ کسی کی موزونیِ طبع، شعر کا بظاہر خوبصورت جسم تو شاید ڈھال لے لیکن اس میں ایک زندہ مچلتی ہوئی روح نہیں پیدا کر سکتی۔ یہ بات قابلِ قبول نہیں ہے کہ اصل شاعر اپنے گردوپیش اور تجربات سے کچھ حاصل کیے بغیر اور اپنے سے پہلے کے اور اپنے زمانے کے شاعروں کے کلام کی خوبیوں، خامیوں کو جانے بغیر بھی اچھا شاعر ہو سکتا ہے۔ بے شک شاعری کا جوہر ہی اصل چیز ہے مگر اس جوہر کو نکھارنے کی ضرورت تو بہر حال ہوتی ہی ہے۔ یہ جو مشہور مصوّر مائیکل اینجلو نے کہا تھا کہ بُت تو پتھر ہی میں چھپا ہوتا ہے اور میرا کام تو فالتو پتھر کو تراش کر الگ کر دینا ہے، تو اس فالتو پتھر کو تراشنے کے لئے بھی تو ہُنر کی ضرورت ہے ورنہ محض پتھر تراشنے سے حُسن کی بجائے بدصورتی بھی تو جنم لے سکتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شاعر بھی انسان ہوتا ہے (شاعر سے مراد یہاں ظاہر ہے ایک اچھا، کامیاب اور مکمل شاعر ہی ہے)، عام انسان اور شاعر میں فرق یہ ہوتا ہے کہ شاعر دوسروں کی نسبت زیادہ حساس اور باشعور ہوتا ہے۔ وہ بات کی تہہ تک دوسروں کی نسبت جلد اور گہرائی تک اُتر سکتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے عام انسانوں کے برخلاف، دنیا میں جتنے بھی علوم ہیں

ان کے کچھ نہ کچھ ذرّات شاعر کے خمیر میں ضرور شامل ہوتے ہیں۔ موسیقی، مصوّری، نفسیات جیومیٹری، انسان شناسی، نجوم، سائنس، غرض بیشتر علوم۔ اور پھر مذہب کی طاقت، عقائد کی قوت ۔ اب ہوتا یہ ہے کہ کسی میں کسی خاص علم کے ذرّات زیادہ ہوتے ہیں اور کسی میں کم۔ اس کا باعث لازمی طور پر حصولِ علم کے وسائل اور تجربے ہوتے ہیں۔ انہی کی وجہ سے شاعر کو نہ صرف اظہار میں بلکہ ابلاغ میں بھی آسانی ہوتی ہے۔ شاعری میں علم کے علاوہ شاعر کا تجربہ اور اس کے جذبہ و احساس بھی شامل ہوتے ہیں۔ شاعر ایک خاص معاشرے میں رہ کر جذبات و احساسات کی تہذیب کرتا ہے، گردوپیش کے حالات سے اسے تجربے کا حصول ہوتا ہے اور پھر فن کا اکتساب، یہ سب کچھ صحیح معنوں میں ایک بہتر اور زندہ رہ سکنے والی شاعری کو تخلیق کرنے کا سبب ہوتے ہیں۔ یہی سب کچھ، بظاہر عام انسان کو ایک شاعر بناتا ہے اور ایک شاعر کی شخصیت کے نقوش کا تعین کرتا ہے۔

جب ہم شعر پڑھتے ہیں تو ہم صرف ایک جذبہ، ایک احساس اور ایک فکر کو شناخت کرتے ہیں، شاعر کی اپنی شخصیت پس منظر میں جا کر دھندلا جاتی ہے۔ تب ہمیں وہ شعر صرف اپنی ملکیت محسوس ہوتے ہیں لیکن اگر شاعر کے شعر اس کی ملکیت جان کر دیکھے اور سُنے جائیں تو پھر ان کے مکمل ابلاغ اور ان کی ساری خوبیوں کو جاننے کے لئے اس کی شخصیت کو بھی پس منظر میں لانا ہوگا۔ شاعر کے کلام کا نقاد بھی شاعر کے تجربے کی شناخت کے لئے کوشاں ہوتا ہے۔

"نقاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ ادب کے ایک شاہکار کی تمام قوت اور پیچیدگیوں کو پوری طرح محسوس کر سکے[۱]۔ شاعری کا نقاد یہ جاننے کی بھی سعی کرتا ہے کہ شعر کی تخلیق

---

۱ Literature and Criticism - by - Coombs

کرنے والا شاعر کن مراحل میں سے گزرا اور اس نے اپنے تخلیقی سفر میں کیا کیا منزلیں طے کیں۔ اس سلسلے میں وہ شاعر کی شخصیت کی تشکیل کے مراحل پر بھی نظر ڈالتا ہے۔ اور انسان کی شخصیت اس کی پیدائش سے لے کر اس کی وفات تک مسلسل صورت پذیر ہوتی رہتی ہے۔ اسی آئینے میں مجھے ناصر کاظمی کی زندگی اور شخصیت کے واضح نقوش دیکھنا اور پھر دکھانا ہیں۔

ناصر کاظمی نے اپنی ڈائری میں اپنی تاریخ پیدائش "۸ر دسمبر ۱۹۲۵ء بروز جمعہ"[۱] لکھی ہے۔ ان کا نام ناصر رضا کاظمی تھا۔ اپنے نام ہی کے ایک حصے "ناصر" کو بعد میں انہوں نے اپنا تخلص بنایا۔ وہ انبالے (بھارت) میں پیدا ہوئے تھے۔ اپنی وفات (۲ر مارچ ۱۹۷۲ء) سے کچھ دن پہلے ٹیلیویژن والوں کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا:

انبالہ ایک شہر تھا سنتے ہیں اب بھی ہے
میں ہوں اسی لٹے ہوئے قریے کی روشنی

تو وہاں سے میں ہجرت کر کے آیا تھا۔ وہاں میں نے جنم لیا۔ والد میرے فوج میں تھے ایک چھوٹا سا معاشرہ تھا۔ ہمارا گھر پرندوں، یادوں، بچوں، پھولوں، درختوں اور ننھی ننھی پیچ در پیچ گلیوں کا معاشرہ تھا۔ اس میں سب لوگ، امیر، غریب بڑے سکھ اور امن سے رہتے تھے اور بڑے بڑے علماء بھی رہتے تھے لیکن ایک عجیب بات تھی اس معاشرے میں کہ جو بظاہر غریب ننھے منے لوگ تھے ان کی عزت بھی اتنی ہی تھی جتنی کہ بڑے لوگوں کی بلکہ شاید ان سے بھی زیادہ۔ ایک وثیقہ نویس اتنی عزت رکھتا تھا اس معاشرے میں جتنی شاید ایک وزیر یا امیر کبیر نہیں رکھتا تھا۔ پھر وہاں ایک سکول تھا چھوٹا سا مسلم ہائی سکول، اس میں میں نے تعلیم پائی"۔[۲]

---

[۱] ناصر کاظمی کی غیر مطبوعہ ڈائری نمبر ۱

[۲] ٹی۔ وی، انٹرویو۔۔۔ انٹرویو لینے والے تھے انتظار حسین۔

ناصر شیعہ عقیدہ رکھتے تھے۔ اپنے خاندان کے بارے میں لکھتے ہیں:

"میرے دادا سید شریف الحسن پولیس انسپکٹر تھے، اور نصیرپور، مگرپورہ اور راج گڑھ کے بہت بڑے زمیندار تھے اور انبالہ کے چند نامور رئیسوں میں سے تھے۔ میرے والد سید محمد سلطان نے بی۔ اے تک تعلیم اسلامیہ کالج لاہور میں حاصل کی۔ نائب تحصیلدار اور سب انسپکٹر بھی رہے۔ لیکن ملازمت کی طرف سے اُن کا دل اچاٹ تھا۔ گھوڑے سواری کا انہیں بہت شوق تھا۔۔۔۔۔ نہایت ہی نمازی، عابدِ شب زندہ دار، مخلص، ایماندار تھے۔ ایسے لوگ دنیا میں بہت نایاب ہیں۔ لاہور میں ۲۹ مئی ۱۹۴۹ء کی صبح کو فوت ہوئے۔ مرتے ہوئے وہ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ "ناصر میرا نام زندہ رکھے گا اور اُردو ادب اس پہ ناز کرے گا"۔[۱]

ناصر کے والد کے بارے میں ناصر کی خالہ کا کہنا ہے کہ وہ بہت نازک مزاج اور کھلی ہوا کے رہنے والے تھے اس لئے ہجرت کے بعد لاہور میں جب انہیں ایک تنگ سے مکان میں رہنا پڑا تو وہ خاصے پریشان ہوئے۔[۲] یہی مزاج تھا کہ انہوں نے اپنے بیٹے کی پرورش شہزادوں کی طرح سے کی تھی۔

اپنے بہن بھائیوں کے بارے میں بتاتے ہیں:

"میرے بڑے بھائی حامد حسین محکمہ پولیس میں ملازم ہیں۔ پہلی والدہ سے ہیں۔ ان سے ایک بہن حمیدہ بانو بھی تھیں جو ۱۸ سال

---

۱ ناصر کاظمی کی غیر مطبوعہ ڈائری نمبر۔ ۱۔

۲ ناصر کاظمی کی خالہ محترمہ صغریٰ بی بی کی ایک تحریر۔

کی عمر میں قلبی حرکت بند ہو جانے سے انبالہ میں فوت ہو گئیں۔ وہ مجھے میری ماں سے زیادہ پیار کرتی تھیں۔ میرا ایک چھوٹا بھائی ہے عنصر رضا جو میری زندگی کا اب آخری سہارا ہے[1]

ناصر اپنی شاعری میں یادوں کا بہت ذکر کرتے ہیں ——— یادیں جو گزرے ہوئے سہانے وقت کو دھندلے پردوں کے پیچھے سے سامنے لے آتی ہیں۔ اس بچپن دنوں کے ڈھیر میں بچپن سے جوانی تک کا زمانہ سمٹا ہوا ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ بچپن سے جوانی تک کا یہ سہانا زمانہ کیا ہے اور کس طرح گزرا اور ناصر اسے کس کس طرح یاد کرتے ہیں۔ ناصر اپنی عام گفتگو اور رسالوں میں چھپنے والے اپنے مکالموں میں بچپن کی یادوں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ اس زمانے کی معصومیت بھی بہت زیادہ اہمیت حاصل کر جاتی ہے۔ وہ ہمیشہ بچپن میں حاصل ہونے والے معصوم تجربات، جذبوں، شعور اور احساس کو صدیوں پہلے گزر چکے زمانوں اور گزرنے والے زمانوں سے ملا دیتے ہیں۔ بچپن اور اس کے تجربات مشہور انگریزی شاعر ورڈز ورتھ کی طرح ان کے لئے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ اس لیے اس زمانے کی یادیں انہیں کبھی نہیں بھولیں:

"بچپن میرا جس کا میں نے تھوڑا سا پس منظر دیا، پاکستان میں آ کر مجھے بہت یاد آتا رہا لیکن تمہیں پتہ ہے کہ یاد جو ہے، انسان کی — وہ ایک یاد جو ہوتی ہے، وہ ہو بہو آتی ہے۔ یاد انتخاب کرتی ہے۔ کچھ واقعات ایسے ہیں جو دوبارہ بار بار آ کر میرا راستہ روکتے ہیں اور حاضرِ بزم ہو جاتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے ؎

بہت قریب سے آئی ہے، دور کی آواز" [2] (ندیم)

---

[1] ناصر کی ڈائری نمبر-۱۔

[2] ٹی۔ وی انٹرویو

ناصر ایک ایسا لاڈلا بچہ تھا جسے بچپن سے ہی بے تحاشہ پیار اور توجہ کا عادی بنا دیا گیا تھا۔ اسے والدین کی بے حد محبت کے علاوہ ننھیال والوں کی بے انتہا شفقت بھی ملی۔ اتنی توجہ، اور پیار دینے والے لوگ ایسے بچوں کے ماتھے پہ مدھم سی شکن اور پلکوں پہ ہلکی سی نمی بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ ایسے بچوں کو ہاتھوں پہ اٹھاتے رکھتے ہیں۔ وہ انہیں پھول دیتے ہوئے بھی پہلے اچھی طرح پرکھ لیتے ہیں کہ اس کے ساتھ کوئی کانٹا تو نہیں لگا رہ گیا۔

> "میری والدہ اپنے، ابہن بھائیوں میں سے ایک تھیں، اور میں اپنے ننھیال کا چشم و چراغ تھا میرا بچپن شہزادوں کی طرح گزرا"......
>
> "بریلی میں میری عمر ۲½ سال کی تھی......... دو خچروں والا تانگہ میرے لئے ہر وقت تیار رہتا تھا۔ محمد دین میرا چپڑاسی تھا۔ وہ مجھے کندھوں پہ بٹھا کر کمپنی باغ کی سیر کراتا"۔[1]

یوں عزیزوں کے پیار محبت اور ملازمین کی توجہ اور خدمت کے ماحول میں نشوونما پاتا ہوا یہ پودا بڑا ہوتا گیا۔ جیسے جیسے اسے اپنی اہمیت کا احساس ہوتا گیا وہ اتنا ہی زیادہ پیار اور توجہ کی خواہش کرنے لگا، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ "عادی" بنتا گیا۔ یہ احساس اور یہ عادت اس کی آئندہ زندگی کے لئے بھی ایک انتہائی ضروری اور سب سے اہم جزو بنتی گئی۔ بعد میں جب اس اہمیّت کے احساس میں زیادتی ہوتی تو انہیں ساتھ ہی تنہائی کا احساس ہونے لگتا اور جب اس اپنے اہم ہونے کے احساس میں کمی ہوتی تو انہیں ایک گہری اُداسی اپنی گرفت میں لے لیتی۔ لاڈ پیار سے عموماً بچے بگڑ جاتے ہیں لیکن چونکہ ناصر کے آس پاس بسنے والے، اسے چاہنے والے لوگ اہلِ علم اور

---

[1] ناصر کی ڈائری۔ نمبر ا

اہلِ ذوق تھے اس لئے ذہین ناصر کے ذوق کی تربیت ہوتی گئی اور اسے اچھے بُرے کی پہچان کرنا بھی آگیا۔۔۔۔ اس شاہانہ اور آرام دہ ماحول میں، جہاں بچوں کی ہر خواہش پوری کر دی جاتی ہو، بچے لاپرواہ اور بے نیاز بنتے جاتے ہیں۔ انہیں ریت کے ریزوں کی چمک متوجہ نہیں کرتی بلکہ ریت سے بنایا ہوا کسی کا گھر دیکھنے یا ڈھانے میں لطف آتا ہے۔ ان کی نظر "تفصیل" کو نہیں "اختصار" کو پسند کرتی ہے۔ ان کی نظر سطحوں پر تھرکتی جاتی ہے۔ رکتی بھی ہے تو کسی چمک دار شے پر یا کسی ناقابلِ حصول چیز پر، جسے پھر وہ حاصل کرنے کی ضد شروع کر دیتے ہیں۔۔۔ لیکن ناصر ایسے ماحول میں رہنے کے باوجود، سمجھ دار ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد حسّاس بچّہ بھی تھے۔ ان کی گھریلو تربیت کے مختلف مراحل کے اثرات میں ضد اور خود مرکزیت بھی شامل ہے۔ یہ شے آخر تک ان میں رہی لیکن ان کا دل نہ مردہ ہوا نہ مردہ تھا۔ چمکتی ہوئی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والے اس صحت مند بچے کو جزئیات اور تفصیل سے بھی لگاؤ تھا اور اس کا صحت مند رویّہ یہ تھا کہ وہ ہر چیز کے بارے میں غور بھی کرتا تھا۔ اب یہاں دیکھیے ریل کا شوق اور پھر سوچ۔۔۔ یہی سوچ بعد میں انہیں ریل کا استعارہ دے گئی:

"میری عمر اُس وقت تقریباً چار برس کی ہوگی، اُن دنوں ہم نوشہرہ میں رہتے تھے اور ریل گاڑی ہمارے گھر کے پیچھے سے گزرتی تھی۔ سارا دن گاڑیاں گزرتی رہتیں۔ لیکن شام ہوتی تو میں نانا کے ساتھ جنگلے کے پاس جا کھڑا ہوتا اور ریل گاڑی کا اس وقت تک انتظار کرتا جب تک اسے دیکھ نہ لیتا۔ ایک دن نانا کو انبالے سے تار آئی اور وہ چلے گئے۔ اس دن میں شام کی گاڑی نہ دیکھ سکا۔ میں رات بھر نیند میں جاگتا رہا اور انجن ہمارے گھر کے صحن میں شنٹ کرتا رہا۔ اس دن 'پاگل' کا لفظ باجی سے میں نے پہلی بار سنا۔۔۔۔

"۔۔۔ دوپہر کی خاموشی میں ریل گاڑی سے بہتر ساتھی مجھے کبھی نہ ملا۔ میں ہر روز دوپہر کو دیوار پر بیٹھا گھنٹوں گاڑی کا انتظار کرتا اور لوہے کے جنگلے کو دیکھتا رہتا۔" [۱]

اس بچے کو ہر وہ چیز حاصل کرنے کا شوق ہے جو اس کو بھا جائے۔ اسے پسندیدہ چیز کوئی نہ دے سکے تو وہ خود اسے اپنانے کی اپنی سی کوشش کرتا ہے۔ اپنی مرضی کو پورا کرنے کی راہ میں اُسے جو رکاوٹ محسوس ہو وہ اسے ہٹا دینے کی سعی کرتا ہے۔ اسے وقت کی پابندی سب سے زیادہ ناگوار رہی۔ اسکول جانے کا وقت ہو جاتا مگر وہ اپنے زندہ کھلونوں یعنی اپنے کبوتروں کی اُڑانوں کو دیکھتا رہتا اور جب اسے یہ کہہ کر زبردستی اسکول لے جایا جاتا کہ گھڑی میں دیکھو۔۔۔ کتنی دیر ہو گئی ہے تو وہ:

"جی میں بگڑتا کہ انسان نے یہ کیسی عجیب چیز ایجاد کی ہے جس نے ساری دنیا کو پابند کر کے رکھ دیا۔ یہ گھڑی میرے اور میرے کبوتروں کے درمیان دیوار بن گئی تھی۔ ایک روز میں نے اس گھڑی کی چابی کو اس زور سے گھمایا کہ وہ چلتے چلتے ٹھہر گئی۔" [۲]

اس بچے نے وقت کو روک لینا چاہا تھا۔ اس ضدی بچے کے والدین ایک شب برات کو خلافِ معمول اس سے پہلے بستر سے اُٹھ گئے۔ اس کی والدہ نے اس کے ساتھ لوہے کا بڑا سا چمٹا رکھ دیا:

"۔۔۔۔ میری آنکھ کھلی تو چمٹا دیکھ کر میں آگ بگولا ہو گیا اور ضد کرتے ہوئے والدہ اور والد سے دوبارہ سونے کو کہا۔ چنانچہ انہوں نے رات کے کپڑے پہنے اور دروازے لگا دیئے۔ پھر میں پہلے اٹھا اور

---

[۱] ایک مکالمہ، "رفتار کا بدن"، رسالہ "سویرا" ۱۹۔۲۰۔۲۱، ص ۴۸۹

[۲] ناصر کاظمی کی غیر مطبوعہ ڈائری نمبر ۲

حسبِ معمول انہیں خود جگایا۔ میں بچپن سے ہی بڑا ضدی تھا۔ اور آج
تک اس ضد نے پریشان کر رکھا ہے۔ میں نے اپنی ضد کو کبھی نہیں دبایا۔
اور کبھی چاہنے والے زندہ تھے تو میری ضدیں بھی پوری کرتے تھے۔ اور
اب یہ دنیا ——— خدا جانے ابھی کیا کیا دیکھنا ہے۔ اور میری
مٹی کہاں کی ہے[۱]؟

یہ بچہ اسکول سے اس لئے بھاگ جاتا ہے کہ اسے باغوں کی دیواروں اور باڑوں سے پرے درخت اور ان کے پھلوں سے لدی شاخیں اپنی جانب بلاتی ہیں۔ وہاں کے گھونسلوں میں رہنے بسنے والے پرندوں کی چہکار پکارتی ہے۔ وہ یہ آوازیں سنتے ہی باقی سب صداؤں سے بے نیاز ہو کر لپکا چلا جاتا ہے:

"سکول سے بھاگ کر میں، محمد علی، افتخار — بیروں، اناروں،
آموں اور امرودوں کے باغ اجاڑتے۔ ایک مرتبہ ہم نے امرودوں
کے باغ میں آگ لگا دی۔ اور اس دن کے بعد باغ کا مالی کبھی نہ سویا۔
بھیڑے والے پیر اور پنج پیروں کے مزار پر بیٹھ کر ہم بیر اور آم
کھاتے تھے[۲]۔"

؎ بچپن میں بھی وہی کھلاڑی بنا ہے اپنا میت
جس نے اونچی ڈال سے توڑے زرد سنہری بیر (دیوان)

اس شرارت میں جہاں فطرت جو پہلے ہی ناصر کو بے حد پسند تھی، کئی حسین سبق دیتی تھی۔ اس "چوری نما" محنت سے حاصل کئے ہوئے پھل کھا کر جو فاتحانہ تسکین

۱۔ ناصر کی ڈائری۔ نمبر ۱

۲۔ ایضاً

اسے حاصل ہوتی وہ اس کی آنکھوں کی چمک اور گالوں کی سُرخی کو اور بڑھا دیتی۔ اور اس کی متجسس طبیعت کسی اور شے کی کھوج میں لگ جاتی۔

ناصر کی غیر مطبوعہ ڈائریوں اور کچھ غیر مرتب اوراق کا مطالعہ کرتے ہوئے اور پھر ان کے عزیزوں اور احباب سے گفتگو کے دوران اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا بچپن بڑا شاندار گزرا تھا۔ نہ صرف اس لحاظ سے کہ انہیں بہت آرام اور آسائشیں میسّر تھیں بلکہ اس لئے بھی کہ ان پر کوئی سخت قسم کی پابندی نہیں لگائی گئی۔ اگر کبھی کوئی زنجیر ڈالی بھی گئی تو یہ اُسے توڑ کر آزاد ہو گئے۔ اسی لئے انہوں نے چھوٹی چھوٹی شوخیوں سے لے کر بڑی بڑی اور خطرناک شرارتوں تک سبھی کچھ کیا:

"نوشہرہ چھاؤنی میں والد صاحب کا تبادلہ ہوگیا۔ وہاں ہم شہر سے دور ایک سرکاری بنگلے میں رہتے تھے۔ رات کو گیدڑ اور دوسرے جنگلی جانور ہمیں سونے نہ دیتے۔ ایک دن میں ریچھ کے غار میں اپنے دوستوں کے ساتھ چلا گیا۔ اور دوست مجھے تنہا چھوڑ کر چلے آئے۔ اگر والد صاحب وقت پر نہ آتے تو اُردو ادب ایک شاعر سے محروم ہو جاتا۔"[1]

"ایک مرتبہ انہیں (ناصر اور ان کے دوست افتخار کو) ایک اور شرارت سوجھی۔ امتحان کے دن نزدیک تھے۔ انہوں نے دو بم بنائے۔ ایک تو کمشنر کی کوٹھی کے پاس گرایا لیکن شکر ہوا وہ پھٹا نہیں۔ دوسرا بم اسکول کے پاس قبرستان میں پھینکا۔ وہ بہت دھماکے سے پھٹا۔ سارا علاقہ کانپ گیا۔ اسی وقت ڈپٹی کمشنر نے شہر میں اشتہار لگوا دیئے کہ یہ معلوم کرو

---

[1] ناصر کی ڈائری نمبر ۱

کہ یہ بم کس نے بنائے ہیں۔ جو کوئی اس کو پکڑ وائے گا، یا اُس کا پتہ لائے گا اُسے دو ہزار روپے انعام ملے گا۔ مگر کسی کو خبر نہ تھی کہ اسی محلّے میں چھپے رستم بیٹھے ہیں۔"[1]

ناصر کو دوست بنانے کا بے حد شوق تھا۔ دوستی میں طبقوں اور ذاتوں وغیرہ کا کوئی فرق نہ ہوتا تھا۔ یہ خوبی اُن میں آخر تک رہی۔ بچپن میں بھی ہر قسم کے لڑکے انہیں گھیرے رہتے اور ان کی حیثیت یہ تھی کہ یوں لگتا تھا جیسے ایک چاند ستاروں کے جھُرمٹ میں ہے۔ انہیں اپنی یہ دوستیاں ہمیشہ یاد رہیں:

جب بھی نئے سفر پہ جاتا ہوں ناصر
پچھلے سفر کے ساتھی دھیان میں آتے ہیں

وہ کوئی دوست تھا اچھے دنوں کا　　　　جو پچھلی رات سے یاد آ رہا ہے

"وہاں میرا ایک دوست کوثر بھی تھا۔ جو ہمیشہ میرے کھلونے چھِپا لیتا اور میں والدہ سے کہتا کہ ٹوٹ گئے۔ وہ غریب اور شریف لڑکا تھا۔ اب نہ جانے کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔"[2]

"لکھنؤ میں بچپن میں میرے ایک دوست تھے۔ وہ دو بھائی تھے۔ انہیں گھر سے دو آنے روز کھانے کو ملا کرتے تھے۔ گھنٹوں امی سے یہی بحث رہتی کہ ان دو آنوں کا صحیح مصرف کیا ہو۔ ایک کہتا پکوڑے کھا لیں۔ دوسرا کہتا نہیں، پیٹ میں درد ہو جائے گا۔ پھر ابا ماریں گے۔ کبھی چڑیا گھر کی سیر کی سوجھتی۔ آخر طے یہی ہوتا کہ چلو دونی کا گل قند کھا لیں۔ نہ پیٹ میں درد ہو گا

---

[1] محترمہ صغریٰ بی بی۔ ایک تحریر۔

[2] ناصر کی ڈائری نمبر ا

نہ ابا ماریں گے"۔[1]

ناصر کو سب بچوں کی طرح کہانیاں سننا بہت پسند تھا لیکن عام بچوں سے مختلف بات یہ تھی کہ ناصر کے لئے کہانی ایک ایسا آئینہ ہوتی جس میں کئی آئینے عکس در عکس پھیلتے جاتے۔ وہ کہانیوں کو بھی پوری سنجیدگی سے سنتے اور سوالات کی بوچھاڑ کئے رہتے:

"ہمیشہ سے آج تک بچوں کو چڑے چڑیا کی کہانی سنتے آئے ہیں کہ چڑیا نے کھچڑی پکائی اور ساری خود ہی کھالی مگر ناصر نے اس کھچڑی پکانے والی بات کو ماننے سے انکار کر دیا بلکہ کہا کہ سب جھوٹے ہیں۔ غلط کہتے ہیں۔ چڑیا نے بھلا آگ کیسے جلائی؟ اس کے پر نہ جل گئے ہوں گے اور ہنڈیا چولہا کہاں سے لائی ہوگی، لکڑی کیسے اٹھائی ہوگی؟"[2]

پھر کہانیاں سنتے سنتے یہ ہوا کہ دلکی چال چلنے والے گھوڑوں پر سوار تُند رفتار شہزادوں کے خوبصورت لباس، زیورات اور ہتھیاروں کے رنگ اور چمک پہلے اس کے دل، پھر اس کی سوچ اور آخر اس کی آنکھوں میں سمٹ آئے یوں وہ خود بھی گھوڑے کی سواری کو بے حد پسند کرنے لگا اور گھوڑے کے سموں تلے اڑتے رنگین غبار میں ایک راجکمار کی طرح "کرن پریوں" اور "خوشبوؤں کی شہزادیوں" کو ڈھونڈنے نکل جاتا۔

"گھوڑے کی سواری کا مجھے بے حد شوق ہے ضلع انبالہ اور پٹیالہ کے تقریباً ۵۰ گاؤں اور پنجاب (گوجرانوالہ، لاہور، پتوکی، شیخوپورہ) کے بیشتر گاؤں میں نے گھوڑے پر سفر کرتے ہوئے دیکھے"[3]

---

[1] ایک مکالمہ "خوشبو کی ہجرت" رسالہ سویرا ۱۷-۱۸- ص ۲۱۳

[2] محترمہ صغریٰ بی بی۔ ایک تحریر

[3] ناصر کی ڈائری۔ نمبرا

ناصر کے بچپن میں کئی شوق تھے۔ سب سے بڑا شوق تو سکول سے فرار اور باغوں وغیرہ میں چوری اور کھیل کود کا تھا۔۔۔ "میرے بچپن میں جو مشاغل رہے ہیں وہ یہی رہے ہیں، گھوڑ سواری، پہاڑوں کی سیر اور غالباً وہی ایک زمانہ تھا جہاں سے میرے ذہن نے فطرت سے محبت اور شاعری سے لگاؤ کے لئے نشوونما پائی"[1]

پھر ناصر تعزیوں سے لے کر دیوالی کے چراغ روشن کرتے تک ہر شے میں گہری دلچسپی لیتے۔

"بچپن میں دیوالی کے موقع پر ہم رنگ برنگی موم بتیاں جمع کر کے پگھلا لیتے۔ پھر اس ہفت رنگ موم سے نئی بتیاں بناتے۔ دیکھنے والا نہیں بتا سکتا کہ اس بتی میں کتنی قسم کا موم ہے"[2]

بچپن کی معصومیت کا ذکر ناصر بڑے پیار سے کرتے ہیں:

"نوشہرہ شہر میں ایک دن صبح صبح میں اپنے کوٹھے پر پراٹھا کھا رہا تھا کہ کچھ کوّے میرے ساتھ آ گئے اور ایک کوّا میرا کھانا لے گیا۔ میں رونے لگا لیکن میری والدہ ہنس دیں اور مولوی اسماعیل میرٹھی کی مشہور نظم (کوّے ہیں سب دیکھے بھالے، چونچ بھی کالی پر بھی کالے) گا کر سنائی۔۔۔۔ ہائے وہ دن بھی قیامت تھے، خواب کی طرح گزر گئے"[3]

"بچپن میں اپنے دو قسم کے [illegible]ھی تھے ایک وہ لڑکے تھے جو اتراتے ہوئے آتے اور بتایا کرتے تھے کہ ہمارے گھر گراموفون آیا ہے، ہمارے بڑے بھائی نے سائیکل خریدی

۱۔ ٹی۔ وی انٹرویو

۲۔ ایک مکالمہ "خوشبو کی ہجرت" "سویرا"۔ ۱۷-۱۸۔ ص ۲۲۰

۳۔ ناصر کی ڈائری۔ نمبر ۱

ہے، ہمارے تایا جان ڈپٹی ہوگئے ہیں۔ دوسرے وہ لڑکے تھے جو آنکھوں میں حیرت لئے دوڑے دوڑے آتے اور بتلاتے کہ ہماری کنگنی پر چڑیا نے گھونسلہ بنایا ہے یا یہ کہ سکول کے پچھواڑے والے درخت پر جو فاختہ نے گھونسلہ بنایا تھا اب اس نے انڈے دیئے ہیں یا یہ کہ فلاں نیم کی کھکھل میں طوطے کے بچے نکلے ہیں۔" لے

ناصر کو دوسری قسم کے بچے ہی زیادہ عزیز ہوں گے۔ یہ وہی ناصر ہے جسے "گھنٹے کے وقت پر بجنے سے سخت چڑ تھی"۔ اس بچے کو کبوتر پالنے کا ایسا شوق ہوا کہ مرتے دم تک پنکھ پکھیرو اس کی نظر کی وسعتوں تک اُڑ اُڑ کر جاتے اور آتے رہے:

ہوا چلی تو پنکھ پکھیرو بستی چھوڑ گئے
سونی رہ گئی کنگنی، خالی ہوئے منڈیر

کُنج میں بیٹھے ہیں چُپ چاپ طیور　　　برف پگھلے گی تو پر کھولیں گے

بیگم ناصر کاظمی نے بتایا کہ "انہیں کبوتروں سے بے حد پیار تھا" ان کی خالہ نے لکھا ہے:

"جب ناصر چھوٹا سا تھا تب ہی سے اُسے کبوتروں کا شوق تھا۔ میرے بڑے بھائی نے بہت کبوتر رکھے ہوئے تھے۔ وہ ان کے لئے مصالحے بناتے تو یہ اُن کے پاس جا بیٹھتا اور کبوتروں سے کھیلتا۔ والد کے ڈر سے گھر میں تو رکھ نہیں سکتا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب چھ سات سال کا ہو گیا تو وہ کبوتروں کے نام اور نسلیں پوچھتا اور آخر خود کبوتر رکھنے شروع کر دیئے۔ بڑے گھر میں اس کی اماں اور دادا نے ڈربا بنوا دیا اور کبوتر بھی منگوا دیئے۔ ایک بار پشاور چلے جانے کی وجہ

لے ناصر کاظمی۔ رسالہ "ادب لطیف"، دسمبر ۱۹۶۲ء "نئے لوگ" / ص ۶۷

سے کبوتروں سے پیچھا چھوٹا لیکن ناصر کے نانا کے انتقال کے بعد انبالہ رہنا ہوا تو پھر کبوتر پالنے کی عادت ہوگئی۔ بازار سے کبوتر مول لاتا اور باہر سے گھر میں پھینک دیتا پھر دوڑ کر اندر آتا اور کہتا کہ اماں کسی کا کبوتر آ گیا ہے، کیسا اچھا ہے، میں تو اسے ضرور پکڑوں گا۔ اور آخر پکڑ کر بند کر لیتا[1]۔
ناصر خود لکھتے ہیں:

"کبوتر پالنے کا شوق مجھے بچپن سے تھا اور ان کے متعلق غیر معمولی معلومات رکھتا ہوں۔ انبالہ میں دور دور کے رئیس میرے کبوتروں کی زیارت کو آتے تھے۔ اور صبح کے وقت جب میرے کبوتر اڑتے تھے شہر میں دھوم مچ جاتی تھی۔ میرے والد، والدہ اور نانی مرحوم میرے کبوتروں کا خاص خیال رکھتے تھے........ ہجرت کے وقت ۱۳ اگست کو میں اپنے تمام کبوتر باوا اسنت سنگھ رئیس انبالہ کو دے آیا تھا۔ نہ معلوم اب کس حال میں ہیں۔ ان کبوتروں کی نسلیں اب ہمارے ملک میں نایاب ہیں[2]۔"

ناصر کو سبھی فنون لطیفہ عزیز تھے:

"موسیقی سے مجھے خاص رغبت ہے۔ ایک مرتبہ استاد عبدالعزیز مرحوم سے ستار اور سارنگی سیکھنے کی کوشش کی لیکن لاہور میں کالج کھلنے پر حسرت دل میں رہ گئی اور اس اثنا میں استاد فوت ہو گئے[3]۔"

بیگم ناصر کاظمی نے بتایا کہ ناصر کے نانا اور امی بہت خوش گلو تھے خصوصاً امی کی

---

[1] محترمہ صغریٰ بی بی ... ایک تحریر

[2] ناصر کی ڈائری نمبر ا

[3] ایضاً

اہمیت اس لئے بھی ہے کہ وہ میرؔ ہی کے اشعار گنگنایا کرتی تھیں، اور ناصر انہی کی طرح گانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ ناصر کا اپنا ترنم بھی اچھا تھا۔ ان کے احباب اس خوبی کا ذکر آتے ہی بہت تعریف کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے مصوّری بھی شروع کی لیکن آخر شاعری میں ہی انہوں نے سب فنونِ لطیفہ کو سمو دیا۔

ناصر کو سیر و تفریح اور سفر کرنا بھی بہت اچھا لگتا۔ انہیں اپنے سفر کی چھوٹی چھوٹی بات بھی یاد رہتی ہے۔ ڈیرہ اسماعیل خاں کی طرف سفر کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"........ دریا خان صبح کے پانچ بجے آیا۔ یہ ننھا منھا غیر آباد اسٹیشن نہایت ہی دلچسپ اور حسین ہے۔ وہاں میرا سرخ کوٹ گاڑی کے نیچے گر گیا جو ہمارے نوکر نے نکالا۔

'سویرا' ۱۹-۲۰-۲۱ میں ایک مکالمے کے دوران اسی واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میرا سرخ کوٹ گاڑی کے نیچے گر گیا۔ اس دن میں نے پہلی بار گاڑی کے پہیوں کو غور سے دیکھا۔ کالے کالے پہیوں میں میرا کوٹ یوں لگ رہا تھا جیسے ذبح کیا ہوا بکرا"۔

...... ایک ماہ کے قیام کے بعد ڈیرہ اسماعیل خاں سے انبالے کی واپسی مجھے یاد ہے۔ شام کے وقت ہم تانگہ لے کر عازمِ دریا خان ہوئے۔ دریائے سندھ طغیانی پر تھا۔ پانی کے جہاز فراٹے بھر رہے تھے جب ہم نے کشتیوں کے دس پاٹ طے کر لئے تو راستے میں اس زور کی آندھی آئی کہ میں نے اپنی زندگی میں ایسا طوفان نہیں دیکھا۔ ہم نے اپنا تانگہ رسوں سے باندھ دیا۔ اونٹوں کے قافلے اور اونٹنیوں کے زرد

زرد، سنہرے بچے پریشان و حیران ریت کے ٹیلوں کی طرف بھاگ رہے تھے
اور وہی دریائے سندھ جو اٹک کے پاس مختصر سا ہے۔ یہاں ایک بحرِ
بیکراں کی طرح ڈبونے کو آمادہ تھا۔ بڑی مشکل سے ہم رات گئے دریا خاں
پہنچے ہیں[۱]

ناصر کے یہاں رات ایک عجیب، پُراسرار مگر پرکشش اور مکمل کردار کی صورت میں آتی ہے۔ راتوں کے جاگنے کا وہ معمول جو آخر تک رہا اس کی عادت انہیں بچپن سے تھی۔ ان کی خالہ لکھتی ہیں کہ "اتنی شرارتوں اور پڑھائی سے بظاہر لاپروائیوں کے باوجود جب سالانہ امتحان کا نتیجہ نکلتا تو ناصر رضا اوّل آتے اور اکثر دوست فیل ہو جاتے۔ محلّے میں سے اکثر دوستوں کی مائیں آکر لڑا کرتیں کہ آپ کا بچہ ہمارے بچوں کا وقت ضائع کرتا ہے۔ در اصل اسے رات کو جاگنے کی عادت بچپنے سے تھی۔ وہ رات بھر جاگ کر پڑھتا جبکہ دوسرے بچوں کو وہ اتنا تھکا دیتا کہ وہ رات آتے ہی سو جاتے تھے۔ ناصر بہت ذہین تھا۔ ماسٹر اس سے بہت خوش تھے اور اکثر اس کی شرارتوں کو بھی نظر انداز کر دیتے تھے"[۲]

ٹی۔ وی انٹرویو میں انتظار حسین نے پوچھا:

"--- ایک بات مجھے یوں یاد آتی ہے کہ جوں جوں رات گزرتی تھی تو تمہاری آواز میں ایک عجیب چمک اور گرمی پیدا ہوتی چلی جاتی لیکن جب صبح ہونے لگتی تھی اور تڑکا ہونے لگتا تھا اور چڑیاں بولتی تھیں تو تمہاری آواز میں بہت اُداسی آجاتی تھی اور جو اُداس شعر تمہیں یاد ہوتے تھے تم اُس وقت سنایا کرتے تھے۔ یہ رات اور صبح کا جو فرق تھا تمہارے یہاں یہ کیا تھا؟"

---

[۱] ناصر کی ڈائری نمبر ا

[۲] محترمہ صغریٰ بی بی۔ ایک تحریر

اس کے جواب میں ناصر نے کہا:

"یہ طلوع و غروب، اصل میں رات میری شاعری میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی وجہ رات، اندھیری رات نہیں یا وہ جسے ہمارے جدید شاعر ایک تاریکی کا استعارہ کہتے ہیں۔ رات تخلیق کی علامت ہے۔ دنیا کی ہر چیز رات میں تخلیق ہوتی ہے۔ پھولوں میں رس پڑتا ہے رات کو، سمندروں میں تموج ہوتا ہے رات کو، خوشبوئیں رات کو جنم لیتی ہیں۔ حتیٰ کہ، فجر تک، فرشتے رات کو اترتے ہیں۔ سب سے بڑی وحی بھی رات کو نازل ہوئی۔ ایک یہ بات۔ دوسری بات یہ ہے کہ تم نے جو اُن راتوں کا ذکر کیا تو اب بھی راتیں جاگتی ہیں لیکن شہر سوتا ہے۔" [1]

یوں ناصر کے لئے آئندہ زندگی میں بچپن کی یہ صرف "عادت" "ایک نئی دنیا میں پہنچ جانے کے مترادف ہوگئی۔ وہ دنیا جو پراسرار ہونے کے باوجود حسین ہے، خاموش ہونے کے باوجود بولتی ہے، یہ تاریک نہیں کہ روشن چاند اور تارے اس کے ہمسفر ہیں۔ اس کی دھندلی فضاؤں میں انسان اپنے خوابوں کی تکمیل ہوتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ سکون اور امن دینے والی دنیا۔ جہاں پابندیوں سے وقتی طور پر ایک حد تک ہی سہی نجات تو مل جاتی ہے اور رومانی مزاج رکھنے والوں کے لئے اس جنت سے بڑھ کر اور کیا شے ہوگی۔

ناصر نے ابتدائی تعلیم وہیں انبالے میں حاصل کی۔

"میں نے پانچویں جماعت تک مشن گرلز سکول میں اور باقی والدہ مرحومہ کے زیر سایہ تعلیم حاصل کی۔ ۱۲ برس کی عمر میں قرآن ختم کیا۔ ۱۳ برس کی عمر میں گلستان، بوستان، شاہنامہ فردوسی، قصہ چہار درویش، فسانہ آزاد، الف لیلیٰ، صرف و نحو اور شاعری کی دیگر کتابیں ختم کرلیں۔ پانچویں اور

---

[1] ٹی۔ وی۔ انٹرویو

چھٹی جماعت میں نے نیشنل ماڈل سکول پشاور سے پاس کی۔۔۔۔ پشاور میں وزیر باغ، شاہی باغ، قلعہ اکبر میری پسندیدہ سیر گاہیں تھیں[۱]۔۔"

(پشاور سے ناصر انبالے چلے آئے اور) "وہاں ہم نے دسویں پاس کر کے۔ لاہور کی خبریں سنا کرتے تھے کہ یہ بڑا شہر ہے۔ پڑھنے کا شوق بھی تھا تو یہاں پڑھنے کے لئے آگیا۔"[۲] اور وہ بچپن کا شاہانہ اندازِ زندگی لاہور آکر بھی قائم رہا۔ بیگم ناصر کاظمی، ناصر کے احباب اور احمد ندیم قاسمی سے گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ انہوں نے کالج میں بالکل الگ کمرہ لے رکھا تھا۔ یوں تو کالج میں ذاتی ملازم رکھنے کی اجازت نہیں تھی لیکن ان کے پاس ایک ملازم بھی تھا جو ان کے لئے الگ سے کھانا پکاتا اور ان کی چیزیں سنبھالے رہتا تھا۔ وہ اپنی شخصیت کو ہمیشہ سنوارے رکھتے۔ شاندار پوشاک سے لے کر مہذب رد لیوں، وضع داری اور شائستہ گفتگو تک۔ اپنے کالج کے زمانے میں بھی وہ ایک شہزادے کی طرح رہے۔ ساتھی انہیں "Prince" کہتے تھے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ناصر نے اپنا بہت خیال رکھا تھا۔ اپنے آپ کو سنوارے رہتے۔ اپنی صحت کی حفاظت کرتے۔ اپنے کپڑوں کی صفائی اور خوبصورتی پہ دھیان دیتے۔ اپنے کھانے پینے پر توجہ دیتے لیکن بعد میں وہ اپنی طرف سے بے حد لاپرواہ ہو گئے تھے۔ بال بکھرے ہیں تو بکھرے رہتے۔ کپڑے شکن آلود رہتے لیکن وہ اپنے شاہانہ

۱ہ ناصر کی ڈائری نمبرا

۲ہ ٹی۔ وی۔ انٹرویو

زمانوں اور عادتوں کو اس وقت بھی نہ بھولے۔ ان کی بیگم کا کہنا ہے کہ وہ ہمیشہ ٹیکسی میں سفر کرنے کی کوشش کرتے۔ بلکہ جب انہیں مشاعروں کے سلسلے میں اسٹیشن یا ہوائی اڈے جانا ہوتا تو اپنے کسی کار والے دوست سے کہہ دیتے کہ وہ کار بھیج دیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ناصر نے شاعری کب شروع کی۔ اور کس طرح شروع کی:

"میرے سارے ہی شغل ایسے تھے جن کا تعلق تخلیق سے اور فنونِ لطیفہ سے ہے، موسیقی، شاعری، شکار، شطرنج، پرندوں سے محبت، درختوں سے محبت، یہ سب جو ہے معلوم ہوتا ہے کہ میرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا۔"[1]

ناصر کی بحیثیت شاعر اپنی پہچان کروانے میں ان کے ماحول کا بھی بہت حصہ ہے: "شاعری مجھے اپنا نانا سید نیاز نبی مرحوم اور والدہ مرحومہ محترمہ کنیزہ محمدی بیگم سے ورثے میں ملی۔ میرے نانا اور والدہ شاعری سے گہرا شغف رکھتے تھے اور خود بھی موزوں طبع تھے۔۔۔۔۔ موسیقی، شعر و شاعری، سوزخوانی اور دیگر فنون سے خاصی دلچسپی رکھتے تھے۔"[2]

ناصر کاظمی پر یوں بھی اپنے ننھیال والوں کا زیادہ اثر ہے۔ اس لئے انہیں شعرا کا کلام پڑھنے اور سمجھنے میں شروع سے ہی کوئی دقت نہ ہوتی ہوگی۔ ناصر کے احباب کا کہنا ہے کہ ناصر کا حافظہ بلا کا تھا: "۔۔۔۔۔ مجھے ناصر کے مزاج کی جو خصوصیات نمایاں نظر آئیں، ان میں سے ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ اچھی شاعری کا غیر مشروط عاشق تھا۔ وہ جہاں میر، مصحفی اور غالب کے کلام کا حافظ تھا

---

[1] ٹی۔ وی انٹرویو۔۔۔۔

[2] ناصر کاظمی، ڈائری نمبرا

وہاں اپنے ہم عصروں بلکہ اپنے سے چھوٹوں کے بھی سینکڑوں اشعار اُسے ازبر تھے۔ اور اچھے شعر کی داد یوں بے ساختگی کے ساتھ اور ٹوٹ کر دیتا تھا کہ اُس کے حُسنِ ذوق کے علاوہ اس کی وسیع القلبی سے بھی متاثر ہونا ناگزیر تھا۔"[1]

یہ صحیح طور سے معلوم نہیں ہو سکا کہ ناصر نے شعر کہنا کب شروع کیا، لیکن اتنا تو معلوم ہے کہ جب وہ اسلامیہ کالج لاہور میں پڑھتے تھے تو غزلیں کہا کرتے تھے۔ اس سوال کے جواب میں کہ شاعری کس طرح اور کیوں شروع کی، اپنے ٹی۔ وی انٹرویو میں بتاتے ہیں:

"یوں لگتا تھا مجھے کہ جو جو خوب صورت چیزیں میں فطرت میں دیکھتا ہوں وہ میرے بس میں نہیں آتیں، میری گرفت میں نہیں آتیں، اور نکل جاتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔ کچھ لمحے، کچھ وقت جو مر جاتا ہے، وہ زندہ دوبارہ نہیں ہو سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاعری میں زندہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے شاعری شروع کی۔ طبیعت موزوں تھی۔ گھر کا ماحول بھی شعر و شاعری کا تھا۔ گھر میں ہمارے میر انیس پڑھا جاتا تھا، نانا میرے موسیقی کا شوق رکھتے تھے اور میر نظیر حسین ناشاد، میر نیرنگ، یہ ہمارے شہر میں بھی اچھی فضا تھی۔ کتابیں بھی گھر میں تھیں، بچپن میں ہم نے شیخ سعدی پڑھا، فردوسی پڑھا۔ یہ سب چیزیں پڑھائی جاتی تھیں۔ ہمیں بچپن میں، قرآنِ حکیم، پورا آہنگ پورا لحن جو تھا وہ شعر کی طرف تھا۔ پھر ایک اور بات ہے جو مجھے سب سے اہم نظر آتی ہے۔ جب میں نے پہلا شعر کہا، مجھے یاد نہیں، مگر یوں لگتا ہے یہ شعر میرا پہلا شعر تھا:

قبول ہے جنہیں غم بھی تیری خوشی کے لیے
وہ جی رہے ہیں حقیقت میں زندگی کے لیے

تو مجھے یوں لگا، اتنی خوشی ہوئی کہ شاید اس سے پہلے مجھے کبھی کسی چیز کی خوشی نہیں ہوئی۔ اگر مجھے شعر کے علاوہ اتنی خوشی کسی اور کام میں ہوتی تو میں شاعری نہ کرتا۔

---

[1] احمد ندیم قاسمی۔ "فنون" اپریل۔ مئی ۱۹۷۲ء (ناصر کاظمی کی یاد میں) ص ۲۰

تو پھر شاعری میں میں نے ایک جادو اور

دیکھا۔ پرانے اساتذہ کا جب کلام پڑھتا تھا تو یوں لگتا تھا کہ زمانے اور صدیاں میرے ساتھ ہمکلام ہیں بلکہ میں اُن صدیوں میں پہنچ گیا ہوں۔ یہ جادو کیا ہے؟ گویا شاعری مردہ لمحوں کو زندہ کر دیتی ہے۔ وہ وقت جو مر گیا جسے کوئی بھی زندہ نہیں کر سکتا، شاعر زندہ کر سکتا ہے اور اسی لیے شاید کہا تھا مولانا نے کہ:

"شاعری جزو ایست از پیغمبری"[1]

"شاعری میں میرا صحیح استاد میری والدہ تھیں اور ویسے آغاز میں کچھ احباب سے مشورے بھی لیتا رہا ہوں۔ حفیظ ہوشیار پوری خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ عشق، شاعری، فن ... بچپن سے میرے خون میں ہے"[2]

ناصر کے زمانۂ تربیت کے عہد کو دیکھنے کے لئے ہمیں اس وقت کی سیاسی فضا اور ادبی فضا کو دیکھنا ہوگا۔ سیاسی فضا کو جاننے کے لئے ہمیں کافی پیچھے جانا ہوگا۔ انگریزوں کی آمد نے یہاں کی عظیم سلطنت کی فصیلوں میں دراڑیں ڈالنا تو شروع کر ہی دی تھیں، لیکن ۱۸۵۷ء میں یہ فصیلیں ڈھ گئیں اور انگریز، ہندوستان پر قابض ہو گئے۔ پھر پنجاب پر انگریزوں اور سکھوں کی اجارہ داری ہوئی تو ظلم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور مسلمان بحیثیت مسلم قوم احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گئے۔ مایوسیوں اور اُداسیوں نے انہیں گھیر لیا۔ اس احساس نے انہیں شل کر کے رکھ دیا۔ ان کی سوچیں بھی مفلوج ہو کر رہ گئیں۔ آخر سرسیّد احمد خاں نے اس بے حس ہوتی ہوئی قوم کو یہ احساس دیا کہ مایوسی کفر ہے۔ ہمیں زمانے کے تقاضوں کے مطابق بھی چلنا ہوگا اور بھلے دنوں کی امید بھی رکھنا ہوگی۔ اور ایسا وقت ضرور آئے گا جب مسلمانوں کو ان کا

---

[1] ٹی۔ وی انٹرویو ....

[2] ناصر کی ڈائری۔ نمبر ۱

کھویا ہوا وقار مل جائے گا۔ آخر سرسید کی سیاسی، تہذیبی، معاشرتی اور تعلیمی سرگرمیوں کے نتیجے میں مسلمانوں کو اپنے حقوق کا احساس ہوا۔ سرسید کے انتقال کے چند برس بعد ہی مسلم لیگ کا اجلاس ہوا اور یہی آغاز ہے اس بیداری کا جس کا نتیجہ پاکستان کی صورت میں سامنے آیا۔

سرسید یقیناً غالب سے متاثر تھے۔ اصلاحی تحریک اور تعلیمی تحریک کی وجہ سے وہ ادب میں افادیت پر بہت زیادہ زور دیتے تھے۔ مولانا حالی نے ان کی خواہش کا احترام کیا۔ حالی صحیح معنوں میں شاعر تھے۔ ابتدا میں انہوں نے بہت خوبصورت غزلیں کہیں۔ لیکن جب اصلاحی شاعری کا خیال آیا تو اُس سے ایک نقصان بھی ہوا کہ حالی جیسا شاعر اعلیٰ شاعری سے محروم ہوگیا۔ لیکن ایک فرد کا نقصان اجتماعی طور پر فائدہ بن گیا۔۔۔ اور اس اصلاحی و مقصدی شاعری کی تحریک کی نہایت خوبصورت معراج اقبال تھے۔ (آگے چل کر یہ تحریک ایک ایسی تحریک کا باعث بنی جس نے اُردو شاعری کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے یعنی ترقی پسند تحریک)۔

علاوہ ازیں محمد حسین آزاد نے اسی زمانے میں باقاعدہ نظم نگاری کو رواج دینے کی سعی کی۔ پھر پاکستان بننے سے پہلے ہی شعر میں نئے نئے تجربے شروع ہو چکے تھے۔ تصدق حسین خالد، میرا جی اور ن۔ م راشد آتے ہیں۔ اس تحریک کے مقلدین میں مختار صدیقی، یوسف ظفر، قیوم نظر وغیرہ ہیں۔ انہوں نے نظم معریٰ کا آغاز کیا۔ اس طرز کے تجربے پرانے شعرا نے بھی کئے تھے۔ مثلاً شرر اور اسماعیل میرٹھی نے۔ لیکن اس طرز میں صحیح شاعری خالد اور فوراً بعد ن۔ م راشد نے کی۔ راشد کا Contribution یہ ہے کہ نظم آزاد کا ایک انداز طے کردیا۔ میرا جی کے ہاں سادہ لفظوں سے پیدا شدہ ابہام اور ایک نیا طرز اظہار اہم ہیں۔ ان شعرا کی نظم نگاری کے ساتھ ساتھ ترقی پسند شعرا کی پابند اور آزاد نظموں کا بھی زور ہوا۔

۱۹۳۵ء سے لے کر ۱۹۴۰ء تک کا عہد رومانیت، بغاوت، انقلابی جدوجہد، سیاسی و معاشی و ثقافتی و معاشرتی آزادیوں کی طلب کا عہد تھا۔ سبھی کے خیالات میں ہلچل مچی ہوئی تھی وہ چاہے ترقی پسند تھے یا غیر ترقی پسند۔

ناصر کا مزاج بچپن ہی سے رومانوی خصوصیات کا حامل تھا۔ جوانی میں اس میں اور شدّت پیدا ہوئی۔ "برگ نے" تک وہ رومانوی ہی رہے۔ اس کے بعد کے کلام سے وہ ایک حقیقت پسند رومانوی بنتے دکھائی دیتے ہیں۔ رومانوی مزاج رکھنے والوں کی طرح ناصر میں بھی انفرادیت پسندی، شدّتِ احساس و تخیّل اور فطرت پسندی ہے اور جذبات کے اظہار کی بھی وہی شدّت ہے۔ ۴۷ء سے قبل اُردو شاعری میں تین نعرے واضح طور پر سنائی دے رہے تھے۔ ایک تو نعرۂ عشق جو معاشرے کے خلاف تھا۔ یہ فرد کے جذباتی رویّوں کی آزادی کا نعرہ تھا۔ دوسرا نعرۂ انقلاب۔۔۔۔ جو سیاسی استبداد اور غلامی کے خلاف اور آزادی کے حق میں بلند کیا گیا۔ اور تیسرا نعرہ بغاوت کا تھا جو سبھی کا تھا۔ ہر ایک باغی ہو رہا تھا اور نئے راستوں کو ڈھونڈھ رہا تھا۔

ناصر کاظمی جب اسلامیہ کالج لاہور میں آئے تو یہاں کی فضا میں شعر و شاعری رچی بسی ہوئی تھی۔ ان کی اپنی طبیعت میں جدّت پسندی اور انفرادیت تھی۔ لہٰذا انہوں نے عام ڈگر ترک کر دی اور روایت سے محض ان شعرا کی رہبری قبول کی جو ان کی طبیعت و مزاج سے مطابقت رکھتے تھے۔ مثلاً میر و فراق۔ جلد ہی ان کی ہمسفری حفیظ ہوشیار پوری کے ساتھ ہو گئی جن سے انہوں نے شعر کی تربیت بھی حاصل کی اور نئی راہوں کی تلاش و جستجو کے لئے تحریک بھی۔ ویسے ناصر اپنے دوسرے بزرگ اور ہم عصر شاعروں سے غافل نہ تھے۔ یقیناً انہیں معلوم تھا کہ کن کن ترقی پسندوں کی غزل میں کیا کیا خوبیاں ہیں اور غیر ترقی پسند کیسی غزل کہہ رہے ہیں۔ اس لئے کہ ناصر حساس ہونے کے ساتھ باشعور شاعر بھی تھے۔

یوں تو ایک شاعر کو کئی چیزوں سے محبت ہوتی ہے۔ اور یہ محبتیں اس کے جذبات و احساسات کی قوتوں کو برقرار رکھتی ہیں لیکن وہ محبت جو ہر شاعر اور خصوصاً رومانوی شعرا کے نزدیک اصل زندگی ہے اور ان کی قوتوں کا سرچشمہ ہے، وہ ہے اپنی جنس کی محبت۔ ناصر کاظمی کے ایک قریبی دوست اور کالج کے ساتھی جیلانی کامران نے بتایا کہ:

"اوّلین محبت کی جو باتیں اس نے مجھے سنائیں ان میں "حمیرا" کا نام آیا تھا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ Humaira انہی ناموں میں سے ایک نام تھا جن میں سلمٰی کا نام بھی آتا رہا لیکن جب وہ "حمیرا" کا ذکر کرتا تو رونے لگتا۔ اور ایک رات تو وہ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کے کاریڈور میں دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ اور دیواروں سے لپٹ رہا تھا اور "حمیرا، حمیرا" کہہ رہا تھا۔ یہ ۱۹۴۴ء کی بات ہے۔"[1]

اب ایک انیس سالہ نوجوان باقاعدہ آنسوؤں سے رو دے اور بے چین ہو ہو کر دیواروں اور ستونوں سے لپٹ جائے تو یہ کوئی فرضی افسانہ نہیں بلکہ سب کچھ ایک ایسی گہری اور حقیقت میں گزری ہوئی کہانی کا خاکہ بناتے ہیں جس نے ایک حساس شاعر کو تڑپا تڑپا دیا۔ یہ شاعر جو بہت ضدی ہے، جسے ہمیشہ سے وہ چیز میسر آتی رہی ہے جو اسے پسند آئی یا جس کی اس نے تمنا کی۔ اس لئے کہ اسے نہ صرف شہزادوں کی طرح رکھا گیا بلکہ یہ شاہزادگی اس کے مزاج کی تہوں میں اتار دی گئی۔ یوں اس کی ہر خواہش پوری کر کے اسے یہ احساس دلایا گیا کہ وہ کبھی کسی شئے کے حصول میں ناکام نہیں رہ سکتا۔۔۔ اور اس لاڈلے شہزادے کو "حمیرا" نہ مل سکی۔ ایسا کیوں ہوا؟ یہ نہیں معلوم۔۔۔ لیکن محبت کی اس ناکامی نے لازمی طور پر وہ مجسمہ

---

[1] جیلانی کامران۔۔۔ ایک خط

توڑ دیا جو ناصر نے خود اپنی شخصیت کو دیکھ کر تعمیر کیا تھا اور جسے اپنی سوچوں میں سجا رکھا تھا۔ ناصر اپنی ایک ڈائری میں ذکر کرتے ہیں: "بچپن میں ابّا جان کھلونے لا کر دیا کرتے تھے، وہ ٹوٹ جاتے تو اور لے آتے۔ یوں کھلونے ٹوٹ جانے کا احساس ہی نہ ہوتا۔۔۔۔ لیکن اب! اب تو ایسا کھلونا ٹوٹا ہے جو کہیں نہیں مل سکتا"[1] یہ شکست ناصر کو انتہائی اداس بھی کر گئی اور اسے حقیقت کی دنیا کا وہ گہرا زخم بھی دے گئی جو کبھی مندمل نہ ہو سکا جس کا مرہم تلاش کرنے کے لئے ناصر بار بار حقیقت کی دوپہروں سے فرار حاصل کر کے رومانویت کی چاندنی راتوں میں بھٹکتے پھرے اور پکارتے رہے:

کہاں ہے تُو کہ ترے انتظار میں اے دوست
تمام رات سُلگتے ہیں دل کے ویرانے
کہاں سے لائیے اب اُس نگاہ کو ناصرؔ
جو ناتمام امنگیں دلوں میں چھوڑ گئی

اپنے آپ کو تسلّی بھی دی:

نئے کپڑے بدل کر جاؤں کہاں' اور بال بناؤں کس کے لئے
وہ شخص تو شہر ہی چھوڑ گیا، میں باہر جاؤں کس کے لئے

آخر خود کو دھوکا بھی دیا، جھٹلایا بھی کہ:

فکر یہ تھی کہ شبِ ہجر کٹے گی کیوں کر
لطف یہ ہے کہ ہمیں یاد نہ آیا کوئی

لیکن کیا وہ واقعی بھول گئے تھے؟ نہیں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ یوں محسوس ہوتا ہے

---

[1] ناصر کاظمی۔۔۔ ڈائری نمبر ۲

کہ انہیں اپنی شاعری کی ابتدا ہی میں محبت کے سلسلے میں یہ دھچکا لگا۔ انہیں محبت نے دکھ اور اُداسی دے دی پھر بھی وہ اپنے شعروں میں اپنے بے وفا محبوب سے بظاہر بے نیاز رہنے کی کوشش کا اظہار کرتے ہوئے بھی یہ کہہ اٹھے:

اے دوست ہم نے ترکِ محبت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

اور انہیں یہ فکر بھی رہی کہ:

مجھے یہ ڈر ہے تری آرزو نہ مٹ جائے
بہت دنوں سے طبیعت مری اُداس نہیں

محبتیں کامیاب رہیں یا ناکام وہ اکثر شاعر کو تخلیقی قوتوں سے ضرور مالا مال کر دیتی ہیں۔ اب خود ناصر میں محبّت کی ناکامی کیسے کیسے حسین اور دل میں اتر جانے والے اشعار کی تخلیق کا باعث بنی۔ اور عجیب اور بڑی بات ہے کہ اس ناکامی نے انہیں زندگی سے نا اُمید بھی نہیں کیا۔

ابھی ناصر زندگی کی دھوپ سے بچ بچ کر سائے سائے ہی چل رہے تھے کہ آزادیٔ برصغیر اور قیام پاکستان کا دن آ پہنچا۔ وہ دن جب آبادی کے ایک بہت بڑے حصّے کو ہجرت کرنا پڑی۔ ناصر کا خاندان بھی ہجرت کر کے لاہور آ گیا۔

"ابھی بی۔ اے کی ڈگری نہیں لی تھی کہ پاکستان بن گیا۔ ناصر گرمیوں کی چھٹیوں میں جب لاہور سے انبالہ گیا تو اپنے آبا کو کہنا شروع کر دیا کہ مکان فروخت کر دیجئے اور لاہور میں کوٹھی بنوا لیجئے یا کوئی بنی بنائی خرید لیجئے اس لئے کہ بہت سے ہندو سکھ اپنے مکانات فروخت کر کے جا رہے ہیں۔ خدا جانے کیسا وقت آ جائے اور ہمیں لاہور جانا پڑے۔ ناصر کے والد یہ سُن کر بہت خفا ہوئے کہ ہم یہیں رہیں گے، اپنے باپ دادا کی قبریں

نہیں چھوڑ سکتے ۔ ناصر کہتا۔ "ابا! یہاں سے ایسے نکلیں گے کہ آپ اپنا حقّہ بھی نہ اٹھا سکیں گے"۔ آخر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ سوائے ایک دو بستر اور صندوقوں کے کچھ نہ لا سکے۔ جس تکیہ کے غلاف میں نقدی نوٹ سی کر رکھے تھے وہ راستے میں کہیں گم ہو گیا۔"[1]

"پاکستان جب قیام میں آیا تو کچھ اپنے دوستوں، عزیزوں پہ مشتمل چھوٹا سا ہمارا ایک قافلہ ــــ جب ہم نے واہگہ بارڈر کراس کیا تو میرے ابا نے پرچم سبز ہلال دیکھا اور کہا، "بیٹا! مبارک ہو! تمہیں پاکستان مل گیا"۔ تو میں نے ابا سے کہا تمہیں بھی مبارک ہو۔ تو میرے ابا کہنے لگے کہ تمہیں اِس لیے مبارک دے رہا ہوں کہ تم وارث ہو اس زمین کے، تمہیں زیادہ رہنا ہے۔ میں تو اب تھکا ہوا سورج ہوں، دیوار تھام کر چل رہا ہوں اور اس کے بعد پاکستان میں جب ہم آئے تو ہم بھی بے سرو سامان تھے۔ تم اُن لوگوں میں ہو جن سے میری پہلے ملاقات ہوئی۔ حسن عسکری، منٹو اور جتنے بھی دوست تھے ــــ ندیم قاسمی صاحب، قتیل شفائی، فیض صاحب، حفیظ ہوشیارپوری صاحب، پھر ملے۔ ۔ ۔ ۔ یہ واپڈا ہاؤس، یہ کچھ نہیں تھا۔ بس کچھ درخت تھے۔ ہاتھ ملا کے ناچتے تھے اور ایسا لگتا تھا رات بھر درخت چاندنی میں ناچتے تھے اور ان کے ساتھ ساتھ ہم پھرتے تھے۔ وہ راتیں ہری تھیں لیکن ایک بات اس میں تھی۔ اس بے سرو سامانی میں ایک جینے کی بڑی امنگ کہ ہم نئے ملک کے وارث ہیں۔ تو اب پاکستان میں آ کر میں نے یہ دیکھا کہ یہ ایک دارالاماں مجھے مل گیا ہے ــــ"[2]

یہ جو ناصر اپنا سب کچھ وہاں چھوڑ آئے تو ایک اس کا ہی دکھ کیا کم تھا، مگر ناصر تو ایک

---

[1] محترمہ صغریٰ بی بی ۔ ۔ ۔ ایک تحریر

[2] ٹی ۔ وی ۔ انٹرویو ۔ ۔ ۔

شاعر بھی تھے، حساس، ہمدرد، بظاہر سوئے سوئے لیکن اصل میں ہمیشہ جاگتے ہوئے شاعر۔ انہیں دوسروں کے دکھ بھی تڑپا گئے اور انہوں نے اپنی ذات کو پہلی بار اتنا پھیلا دیا کہ وہ سارے اجتماع پر بادل کی طرح چھا گئے۔ اُن کا دکھ سب کا دکھ ہو گیا اور سب کا غم اُن کا غم بن گیا۔ وہ کہہ اٹھے:

شہر در شہر گھر جلائے گئے　　یوں بھی جشنِ طرب منائے گئے

اک طرف جھوم کر بہار آئی　　اک طرف آشیاں جلائے گئے

کیا کہوں کس طرح سرِ بازار　　عصمتوں کے دیئے بجھائے گئے

وقت کے ساتھ ہم بھی اے ناصرؔ　　خار و خس کی طرح بہائے گئے

آنکھوں میں چھپائے پھر رہا ہوں　　یادوں کے بجھے ہوئے سویرے
دیتے ہیں سراغ فصلِ گل کا　　شاخوں پہ جلے ہوئے بسیرے
جنگل میں ہوئی ہے شام ہم کو　　بستی سے چلے تھے منہ اندھیرے
روداد سفر نہ چھیڑ ناصرؔ　　پھر اشک نہ تھم سکیں گے میرے

گلی گلی آباد تھی جن سے کہاں گئے وہ لوگ
دلّی اب کے ایسی اُجڑی گھر گھر پھیلا سوگ

جنہیں ہم دیکھ کر جیتے تھے ناصرؔ
وہ لوگ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں

جو کچھ ناصر پیچھے چھوڑ آئے اس میں ان کا انتہائی شاندار بچپن اور نوجوانی کا زمانہ ہے، اُن کے کبوتر ہیں۔ ان کے باغ ہیں۔ وہاں کی خاص تہذیب، ثقافت اور معاشرت ہے، اولین محبت کے دکھ کی دھیمی دھیمی ٹیسیں ہیں۔ کارواں تو آگے بڑھ آیا لیکن پیچھے بہت

کچھ چھوڑ آیا۔ اور یہ بیش بہا دولت یادوں میں ڈھل گئی جیسن یادیں، جو افسردہ بھی کرتی ہیں اور آس پاس کے اجنبی اور غیر مطابق ماحول میں سکون بھی دیتی ہیں۔ یہ یادیں ہی انہیں غم کے زندگی بخش پہلو سے بھی آشنا کراتی ہیں۔ انہیں دُکھی تو کر دیتی ہیں لیکن مایوس نہیں ہونے دیتیں۔ اس لئے کہ وہ ان صدموں کے ملنے سے پہلے ہی کہہ آئے تھے کہ:

مایوس نہ ہو اُداس راہی پھر آئے گا دورِ صبح گاہی

"ایک بات اس میں تھی، اس بے سروسامانی میں۔ ایک جینے کی بڑی اُمنگ تھی کہ ہم نئے ملک کے وارث ہیں۔"[1] لیکن امید سے بھرے ناصر جب یہاں پہنچے تو ایک تو یہاں وہ شہزادوں والے طور قائم نہ رکھ سکے، "دوسرے ان پر کئی ذمہ داریاں بھی آ گئیں۔ زیور اور رقم تو راستے ہی میں کھو آئے تھے۔ ادھر والد صاحب کی پنیشن ہو گئی۔ گھر کا سامان کچھ نہ تھا۔ آخر فلین روڈ پہ ایک کوٹھی میں قیام کیا۔ لیکن یہ کوٹھی بھی کسی افسر کو الاٹ ہو گئی۔۔۔۔۔۔ آخر پُرانی انارکلی میں ایک مکان میں آئے۔ مکان تو کافی بڑا اور کئی منزلہ تھا لیکن ایک منزل میں ماموں جان، دوسری منزل میں ماموں کی چھوٹی بیٹی اور نیچے کی منزل میں ناصر کے والدین تھے۔ اس کا بھی باورچی خانہ اور صحن ماموں کی بڑی بیٹی کے پاس تھا۔ خیر جس طرح ہو سکا گزارہ کیا۔"[2]

دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ ایک ضدی، لاپرواہ، بے نیاز اور ہمیشہ آرام و آسائش کے لمحات میں گُم رہنے والا نوجوان اب ایک نامساعد ماحول میں "گزارہ" کر رہا ہے۔ اور یقیناً یہ ناصر کے لئے سب سے تلخ حقیقت تھی۔ ان سب دُکھوں نے مل کر

---

[1] ٹی۔ وی انٹرویو۔۔۔۔۔

[2] محترمہ صغریٰ بی بی۔۔۔۔ ایک تحریر

ناصر کی غزل کو وہ حسن، وہ گہرائی، وہ معنی خیزی دی کہ محمد حسن عسکری جیسے نقاد، رسالہ "ساقی" میں "جھلکیاں" کے عنوان کے تحت لکھی گئی تحریروں میں اس نوجوان شاعر کی غزل میں فسادات کے تجربے کو بہت خوبی سے سمونے کی تعریف کر اٹھے۔ اور ایک سال بعد یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ بیشتر شعرا ناصر کی اندھادھند تقلید میں مشغول ہیں...... "ناصر کاظمی کی غزل کو ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ لوگوں نے اسے بھی ایک نسخہ بنا ڈالا ہے۔ جس طرح لوگ غزل کہتے ہوئے یہ فرض کر لیتے تھے کہ چھوٹی بحر میں کہا تو غزل یقیناً اچھی ہوگی اسی طرح اب یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ اگر غزل میں وہ الفاظ اور ترکیبیں آگئیں جو ناصر کاظمی نے استعمال کی ہیں تو غزل کی کامیابی میں شبہ نہیں"......... حالانکہ اصل میں...... "ان کا تجربہ ان کے اندر جذب ہو کر رہ گیا ہے لیکن جو لوگ غزل میں ان کی پیروی کر رہے ہیں انہوں نے چند الفاظ کو تجربے کا قائم مقام بلکہ نعم البدل سمجھ لیا ہے......... تجربے کے ساتھ جو درد سہنا پڑتا ہے اس کی مصیبت سے بھی بچ گئے اور غزل گو بھی بن گئے.... "(اسی وجہ سے ہوا یوں کہ) ناصر کے اسالیب بیان کو اس کثرت سے استعمال کیا گیا ہے کہ وہ خود اس سے کترانے لگے ہیں۔"[1]

اس اقتباس سے ناصر کی غزل کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ناصر کی غزل میں وہ خصوصیات شامل ہونا شروع ہوئیں جن کے دم سے انہیں غزل کو حیاتِ نو بخشنے والا مسیحا کہا جانے لگا۔ وہ غزل کہنا تو شروع کر چکے تھے لیکن ان کا وہ خاص انفرادی رنگ جو بعد میں ان کی پہچان بنا، ۱۹۴۷ء کے بعد ہی ابھرا درا صل، "ناصر کاظمی کی شاعری کی نشوونما، ۱۹۴۷ء کے آس پاس ہوئی ہے اور اس

---

[1] محمد حسن عسکری، رسالہ "ساقی"، سالنامہ جنوری فروری ۱۹۵۳ء (جھلکیاں)

زمانے میں ان کے ماحول کو جس آشوبِ قیامت سے دوچار ہونا پڑا ہے اس کی انہوں نے حقیقت سے بڑی ہی بھرپور ترجمانی کی ہے۔ زندگی اس زمانے میں جس طرح موت سے دوچار ہوئی ہے، رونقوں کا جس طرح خاتمہ ہوا ہے، بہاروں پر جس طرح خزاں آئی ہے، آشیاں جس طرح برباد ہوئے ہیں اس کو ناصر نے اس طرح پیش کیا ہے:

"رونقیں تھیں جہاں میں کیا کیا کچھ　　لوگ تھے رفتگاں میں کیا کیا کچھ

کیا کہوں تم سے اے خزاں والو　　جل گیا آشیاں میں کیا کیا کچھ"[۱]

یہاں آکر ناصر کو مالی حالات نے تو پریشان رکھا اور ان کے ادب کے میدان میں مخالفین بھی بہت سے تھے لیکن یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں چاہنے والے بھی بہت تھے۔ ان کا مزاج ہی ایسا بن گیا تھا کہ وہ ملازمت نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ شادی ہونے تک انہوں نے ملازمتوں میں بالکل دلچسپی نہ لی۔ ۱۹۵۲ء میں ان کی شادی ہوئی اور اس دن اُن کی "برگ نے" بھی چھپ کر آ گئی یوں بحیثیت شاعر ان کی مقبولیت اور شہرت کے لئے ایک راستہ متعین ہوا اور بحیثیت ایک ذمہ دار انسان بھی انہیں اپنے فرائض کا احساس ہوا۔ "جب یہ کتاب چھپی تو میرے لئے میری زندگی میں سب سے نیا واقعہ تھا"[۲]

بیگم ناصر کاظمی نے ان کی ملازمتوں کی تفصیل بتاتے ہوئے کہا کہ میرے والد نے شادی کے لئے یہ شرط عائد کی کہ ناصر پہلے ملازمت کریں۔ ناصر اپنی ضد پر اڑے رہے۔ بالآخر انہیں ریڈیو پاکستان میں ملازمت کرنا پڑی۔ مگر شادی ہوتے ہی اپنی ضد کو

۱؎ ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ "جدید شاعری"، (ناصر کاظمی اور برگ نے) ص ۵۰۰

۲؎ ٹی۔ وی۔ انٹرویو

پورا کیا اور ملازمت چھوڑ دی۔ پھر رسالہ "ہمایوں" کی ادارت کی۔ پونے پانچ سال بعد رسالہ بند ہو گیا۔ پھر اپنا رسالہ "خیال" نکالا۔ وہ چلا نہ سکے۔ محکمہ اطلاعات کے ایک شعبے میں ملازم ہوتے۔ یہ شعبہ بھی ختم ہو گیا۔ "ہم لوگ" کے ایڈیٹر رہے۔ اسی طرح چھوٹی چھوٹی ملازمتوں کے سہارے گھر کا انتظام چلتا رہا۔ آخر پھر سے ریڈیو پاکستان میں ملازم ہو گئے اور تقریباً سات آٹھ سال اپنی وفات تک وہیں رہے۔

ان کی بیگم کا کہنا ہے کہ شروع میں وہ گھر سے لاپرواہ تھے۔ انہیں پتہ ہی نہ ہوتا کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ انہیں یہ تک معلوم نہ ہوتا کہ ان کے بچے کس جماعت میں ہیں۔ لیکن آخری برسوں میں وہ اپنے بچوں کے بے حد قریب آ گئے تھے۔ ناصر کے بڑے بیٹے باصر سلطان کاظمی کا کہنا ہے کہ آخری برسوں میں تو وہ ہم سے بالکل ہم عمر دوستوں کا سا برتاؤ کیا کرتے۔ ہماری کامیابیوں پہ بے حد خوش ہوتے۔ آخری وقت میں ان کی یہ توجہ ہمیں اب اور زیادہ تڑپاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ پہلے وہ بچوں سے اور گھر سے جان بوجھ کر بے نیاز رہتے تھے وہ تو اپنے آپ کو بھی بھولے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود وہ گھر بار کے خرچ کے لئے ضرور کچھ نہ کچھ کام کرتے ہی رہتے اور انہیں ایک دن کی بھی پریشانی نہ ہونے دیتے ؎

تمام عمر یونہی ہم نے دُکھ اٹھایا ہے
زیادہ خرچ کیا اور کم کمایا ہے

یعنی بہرحال وہ کماتے ضرور رہے۔ اصل میں بات یہ تھی کہ انہوں نے شاعری اور زندگی کو ایک کر رکھا تھا: "... دراصل اس کے یہاں گڑبڑ یہی ہے کہ اس نے زندگی اور شاعری کو گڈمڈ کر رکھا ہے۔ وہ شعر کہتا ہی نہیں شعر جیتا بھی تھا۔ ...

... حلیہ کے اعتبار سے وہ زیادہ عجیب نہ سہی لیکن جب وہ اکیلا چلتا ہوا دکھائی دیتا ہے تو واقعی عجیب چیز ہوتا ہے۔ اکثر اس کے ہاتھ میں سگریٹ بھی ہوتی

ہے۔ ایک ہاتھ اچکن کی جیب میں، دوسرے ہاتھ میں سگریٹ لگی ہوئی، منہ کا رُخ ترچھے سے انداز میں آسمان کی طرف اور اس عالم میں وہ یوں چلتا ہے گویا قدموں کے نیچے والی مال روڈ وجود ہی نہیں رکھتی اور انارکلی کے بھرے بازار سے وہ اس بے نیازی سے گذرتا ہے گویا وہ ہنگامہ وہ لوگوں کا ہجوم، وہ سجی بنی دکانیں اور کاریں، وہ پری چہرہ لوگ سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔ ایسے عالم میں وہ اکثر دوستوں کو بھی پہچاننے سے انکار کر دیتا ہے۔ سامنے سے گذر جائے گا، دیکھ لے گا اور یار میرے کو پتہ نہیں چلے گا کہ کون گذر گیا۔ ناصر کاظمی غریب اپنی شاعری پہ قابو نہیں رکھ سکا۔ اس کی شاعری اس کی زندگی میں درآنہ گھس آئی ہے۔"[۱]

"ناصر کی سب سے بڑی خوبی اُس کی اپنے فن کے ساتھ وابستگی تھی۔ اور اس خوبی میں مَیں نے فرق آتے نہیں دیکھا۔ انسان اور شاعر کے درمیان اس نے ایک مساوات قائم کر رکھی تھی۔ اور جب وہ مجھے ملا اس نے یہی تاثر دینے کا اہتمام کیا۔"[۲]

ناصر کے ایسے رویے کی جھلک جب بچپن میں اس کی بڑی بہن نے دیکھی تھی تو اسے "پاگل" کہہ دیا تھا، اور دوست احباب اسے ناصر کی "انجو بگی" کہنے لگے۔ اور اس انجو بگی کو پہچاننے کی سعی کرتے رہتے:

"اُن کی شخصیت میں سحر و اسرار کی ایک فضا تھی اور نگاہ میں طلسم بندی کی ایک ایسی کیفیت کہ سامع خود کو بندھا ہوا محسوس کرنے لگتے۔"[۳]

---

[۱] انتظار حسین۔ "نقوش"، مئی ۷۲ء (آنکھ رکھتا ہے تو پہچان مجھے) ص ۱۷۱

[۲] جیلانی کامران۔۔۔ ایک خط

[۳] خورشید رضوی۔ "اوراق" مارچ ۷۲ء (ناصر کاظمی) ص ۳۰۱

انتظار حسین ایک واقعہ سناتے ہیں جو ان کی عجوبگی کے سلسلے میں ہے:

"یہی کوئی ڈھائی تین سال کی بات ہے، میں پرانی انارکلی سے گذر رہا تھا۔ دیکھا ــــ کہ ناصر کاظمی اپنی گلی کے سامنے اکیلا چپ چاپ سا کھڑا ہے۔ علیک سلیک ہوئی۔ دو چار اِدھر اُدھر کی ہوئیں، پھر میں نے کہا "آیئے کاظمی صاحب کہیں چل کر چائے پیئیں"۔ جواب دیا۔ "اس وقت تو نہ جاسکوں گا۔ آیئے پان کھالیں"۔ سامنے پنواڑی کی دُکان تھی۔ مجھے پان پیش کیا خود پان کھایا۔ پھر سگریٹ سلگاتے ہوئے کہنے لگا کہ "انتظار صاحب چائے پینے چلتے مگر اس وقت ذرا قصہ یہ ہے کہ میری والدہ کا انتقال ہوگیا ہے۔ میں سٹپٹا سا گیا کہ کاظمی کو پرسا کیسے دوں۔"[1]

بیگم ناصر کاظمی کا کہنا ہے کہ ناصر صاحب کچھ عجیب سے تھے۔ بالکل مختلف قسم کے انسان تھے دوسرے لوگوں کی لنسبت ابنارمل سے۔ عام بات بھی سجا بنا کر کرتے تھے۔ سُننے والا اُسے عجیب بات سمجھتا۔ ناصر کے ایک دوست شیخ صلاح الدین صاحب سے گفتگو کے دوران معلوم ہوا کہ اُن کی یہ عادت تھی کہ وہ عام باتوں میں بھی Fantasy کا عنصر شامل کر دیتے تھے اور ان کی باتوں میں ایک پُر اسراریت ہوتی تھی۔ اگر ان باتوں کو غور سے سُنا جاتا تو وہ سمجھ میں آجاتیں لیکن سرسری طور پر دیکھنے سے سننے والی باتیں معلوم ہوتیں۔

"اپنی طرف سے تو اس نے غچہ دینے کو بھی ایک فن ہی بنانے کی کوشش کی ہے جس انداز سے وہ یاروں کو جُل دیتا ہے اور جس میں خوبصورت بہانوں سے لے کر تیلیوں کی معنی خیز گردش تک بہت سی نازک حرکتیں شامل ہیں، اس کے متعلق اس کا تو یہی خیال ہے کہ اسے کوئی بھانپ نہیں سکتا۔ مگر اتنا ضرور صحیح ہے کہ اس

---

[1] انتظار حسین "نقوش"، مئی ۱۹۵۲ء (آنکھ رکھتا ہے تو پہچان مجھے)۔ ص ۱۷۲

انداز کو بہت سے لوگ واقعی نہیں بھانپ سکتے ہیں۔

یہ واقعی ان کی عادت تھی کہ وہ بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے۔ لیکن ہر بات کی تہہ میں ایک سچائی کی بنیاد ضرور ہوتی جس پر یہ بلند و بالا عمارت تعمیر ہو جاتی۔ یہ مبالغے اور پُراسراریت اُن کی وہ خواہشیں ہیں جو زمانے نے پوری نہ ہونے دیں۔ ان کی نیک نیتی پر شبہ نہیں کرنا چاہیئے۔ ان کی اسی عادت کی بنا پر انتظار حسین، ناصر پر اپنے ایک مضمون "آنکھ رکھتا ہے تو پہچان مجھے" میں اپنی ہنسی کو روک نہ سکے۔ اس سلسلے میں ناصر کے متعلق طرح طرح کی باتیں مشہور ہیں۔ مثلاً سجاد باقر رضوی صاحب نے کہا کہ انہیں صوفی غلام مصطفےٰ تبسم نے بتایا کہ جب صوفی صاحب سنت نگر میں رہتے تھے تو وہاں سیلاب آ گیا۔ کچھ عرصے بعد ناصر سے ملاقات ہوئی تو ناصر کہنے لگے۔ "دیکھیئے صوفی صاحب! میں نے سیلاب کا سُنا تو مجھے بہت فکر ہوئی۔ میں اپنے ایک فوجی افسر کی جیپ میں سوار ہو کر آپ کے گھر کی طرف گیا۔ بہت پانی تھا۔ پانی میں آگے ہی آگے بڑھتے گئے مگر جب چوک میں پہنچے تو پانی گھوڑے کی گردن تک آ گیا۔" اس لئے میں لوٹ آیا۔ بعد میں احمد ندیم قاسمی کا کہنا ہے کہ میں نے جب ان سے پوچھا کہ جیپ گھوڑا کیسے بن گئی تو ناصر نے جواب دیا کہ ایسے ہی احباب نے بات بنا رکھی ہے۔ لیکن یہ بات سچ نہ بھی ہو تو ناصر کی باتوں میں جیپ سے گھوڑا بن جانے والا قصہ کچھ ایسا غلط بھی نہیں لگتا لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ کئی بار احباب کو اُن کی بتائی ہوئی معلومات پر شبہ ہوا اور انہوں نے تحقیق کی تو ان کی باتیں پچانوے فی صد درست نکلیں۔ اور مبالغے کا عنصر جو ایک شاعر کا تخیل تھا وہ صرف پانچ فیصد ثابت ہوا۔ ہم اگر ناصر کی شخصیت سے اس بے ضرر مبالغہ آمیز باتیں کرنے والی

۱؎ انتظار حسین: "نقوش" مئی ۱۹۵۲ء (آنکھ رکھتا ہے تو پہچان مجھے)۔ ص ۱۶۸

خصوصیت کو الگ کر دیں تو ہم انہیں پہچان نہ پائیں گے۔ اپنے بارے میں اس قسم کی شاہانہ گفتگو ان کے احساسِ برتری کو ظاہر کرے یا احساسِ کمتری کو، ہمیں تو کم از کم ان سے نفرت نہیں ہوتی بلکہ ان پر اور پیار آتا ہے۔ ناصر نے زندگی اور شاعری کو ایک کر رکھا تھا اس لیئے وہ جس بھی موضوع پر باتیں کر رہے ہوتے اپنے حسین تخیل سے ضرور مدد لیتے اور سامع کبھی اکتاہٹ محسوس نہ کرتا۔ پھر ناصر کی گفتگو اتنی اوریجنل اور اتنی تخلیقی تھی کہ جب بھی ہم دونوں کسی مشاعرے کے سلسلے میں ہم سفر ہوئے، تو میرا جی چاہتا تھا کہ وہ باتیں کرتا جائے اور میں سنتا جاؤں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ باتیں نہیں کر رہا، بلند آواز میں شعر سوچ رہا ہے اور اس کی گفتگو ہمیشہ شعر و ادب کے بارے میں ہوتی تھی اور اشعار کے حقیقی مفہوم کو اُجاگر کرنے کے لیئے وہ زبان و بیان اور جذبہ و خیال کے بے شمار نکات کھولتا جاتا تھا۔"[1]

ان کی عام گفتگو کے فقرے بھی خوبصورت مصرعوں کی طرح ہوتے۔ ناصر کاظمی سے باتوں باتوں میں کئی مرتبہ یہ سُنا ہے کہ "لفظ یوں آئیں جیسے کسی نے چراغ جلا کے رکھ دیئے ہیں"

"اس فقرے پر میں نے کئی مرتبہ سر دُھنا ہے اور حسد بھی کیا ہے کہ یہ فقرہ میں نے کیوں نہ کہا"[2]

یہاں مناسب ہوگا اگر ناصر کے نظریۂ فن کی طرف بھی اشارہ کر دیا جائے۔ سب سے پہلے ناصر کاظمی کے "برگ نے" میں دیباچہ "اعتبارِ نغمہ" پر نظر ڈالتے ہیں:

"۔۔۔۔ شاعر نے اس باولے کا بھیس بنا رکھا تھا جو ہر گاؤں کے گرد اگرد چکر کاٹتا ہے اور آنے والے حادثوں کی خبر دیتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ یہ پگلا گاؤں سے کتنا پیار کرتا ہے اور گاؤں والوں کے دُکھ میں کس محبت سے اشک فشانی کرتا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس پگلے کی پیغمبری ایک بڑا ناگوار اور دلدوز فریضہ ہے جس کو ادا کرنا کسی محفل پرست، دنیا دار اور مصلحت آشنا سخن ساز کے بس کی بات نہیں۔۔۔ آج کا شاعر نگری نگری گھومنے والے شاعر اور درباری سخن ساز دونوں کے مختلف مزاجوں کو ملا کے ایک نئی آواز پیدا کرنا

---

[1] احمد ندیم قاسمی "فنون"، اپریل مئی ۱۹۷۲ء (ناصر کاظمی کی یاد میں) ص ۲۸

[2] انتظار حسین، "نقوش"، مئی ۱۹۵۲ء (آنکھ رکھتا ہے تو پہچان مجھے)

چاہتا ہے، جو اس کے اپنے گردوپیش اور اس کے اپنے آسمان و زمین سے بھی علاقہ رکھتی ہو۔۔۔
۔۔۔ آواز قوی ہو تو دور دور پہنچ جاتی ہے، نحیف ہو تو حلق سے باہر ہی نہیں نکلنے پاتی، صرف پہنچنے کی بات نہیں، دیکھنا یہ ہے کہ ایک آواز ہزاروں کی آواز بن بھی سکتی ہے یا نہیں۔۔۔
نالہ محض لبیں بر ہم نہیں کرتا۔ نالہ آفریں پہ جو کچھ بھی گزری ہو اس کی فریاد فن کے سانچے میں ڈھل کر نغمہ نہیں بن سکتی تو محض چیخ پکار ہے۔" (۱)

"۔۔۔۔ تیسرے درجے کا لکھنے والا محض روایت کا سہارا لے کر روایتی انداز میں روایتی جذبات کا اظہار کرتا ہے اور پرانے ماہرین کے فن کے بچے تلے مفروضوں کو بغیر ہضم کیے اگل دیتا ہے۔ تیسرے درجے کے لکھنے والے کے قاری بھی تیسرے درجے کے انسان ہوتے ہیں۔ تیسرے درجے کا لکھنے والا روایت کو محض مورخوں کا زہرہ سمجھتا ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں اور عام انسان بھی اپنے جذبات کے ہجوم میں اپنے جذبات کی داد دیتا ہے۔ اسے شاعری یا ادب سے کوئی سروکار نہیں۔
فن کار کا روئے سخن کسی ایسے امازی قاری کی طرف نہیں ہوتا کیونکہ وہ روایت کو جہاں اپنے ماضی کا جیتا جاگتا سرمایہ سمجھتا ہے وہ اسے مستقبل کی Water Supply کا منبع بھی سمجھتا ہے۔ شاعر کا کام تو نئے تجربات اور حقائق کو جانے پہچانے جذبات سے منسلک کرنا ہے۔ ہر تخلیق حال ہے۔ فن کار کا یہی کام ہے کہ وہ ماضی کو حال بنا دے اور اس میں وہ تمام تجربات سمو دے جو مستقبل کے سرچشمے بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ فن کار ایک وسیع المشرب شخصیت کی طرح اپنے اندر دو چیزوں کا احساس ضرور رکھتا ہے۔ ایک درخت دوسری پرندہ۔ پرندہ اڑ کر گم شدہ نادیدہ زمانوں کی خبر لاتا ہے اور ان کے اسملہ پھر اسے آ بتاتا ہے۔ درخت دن بدن بڑھتا رہتا ہے۔ ان دونوں کی مدد سے ایک

۱؎ ناصر کاظمی۔ دیباچہ "برگ نے"، (اعتبار نغمہ) ص ۵-۶

تخلیقی شخصیت کسی فن پارے کو وجود میں لاتی ہے۔ وہ لکھنے والا جو نئے حقائق دریافت کرتا ہے اور انہیں جانے پہچانے جذبات سے منسلک کرتا ہے وہ عام آدمی کو ایک دم متاثر نہیں کر سکتا۔ عام آدمی کو تو جانا پہچانا، محفوظ کیا ہوا، میٹھا رس بھرا جذبات کا گنا چاہیے۔۔۔۔

"روایت کے معنی علم اور تہذیب کی وہ تمام استعداد ہے جو انسان کو آج تک حاصل ہوئی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ انفرادیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ روایت کو سرے سے نظر انداز کر دے لیکن وہ روایت ہی خام ہے جس میں انفرادی صلاحیت کے پنپنے کی گنجائش نہیں۔"[1]

"میں ہوں" کا احساس بھی اجتماع ہی سے پیدا ہوتا ہے اور اجتماع کے تمام شعبوں اور ان کے مشاہدوں اور تجربوں کی تفاصیل کو فن کار ایک مرکز پر لا کھڑا کرتا ہے یہ وہ اجمال ہے جس سے تفصیل تراوش کرتی ہے۔"[2]

یہ مختلف آراء ناصر نے فن پر دی ہیں۔ نہ جانے ناصر کو فن برائے فن ہی کا پیرو کیوں سمجھا جاتا ہے۔ ناصر کی تو شروع کی غزلیں بھی فن برائے زندگی سے عاری نہیں سمجھی جا سکتیں۔ پھر ناصر اپنے مضمونوں اور اپنی باتوں میں اپنی ہی تردید کیوں کرتے ہیں؟ دراصل بات یہ ہے کہ ناصر کے کلام پر شروع شروع میں جن لوگوں نے تنقید کی یا رائے دی وہ ادب میں صرف فن برائے فن کو ماننے والے لوگ تھے۔ یوں ناصر جن کی شاعری میں زندگی ہے، سانسوں کے زیر و بم ہیں، جذبوں کے اتار چڑھاؤ ہیں' وہ بحثوں میں اپنی ہی خوبیوں سے انکاری ہو گئے۔ انہوں نے اس چاروں طرف پھیلی ہوئی زندگی کے مسائل کی طرف اپنے ابتدائی کلام میں جگہ جگہ واضح اشارے کئے ہیں، مثلاً:

گلِ شب تاب کی خوشبو لے کر   ابلقِ صبح روانہ ہو گا

---

[1] ناصر کاظمی، "سویرا"، ۱۷-۸ ایک مکالمہ (خوشبو کی ہجرت) ص ۲۰۱ اور ۲۲۰

[2] ناصر کاظمی، "سویرا"، ۱۹-۲۰-۲۱-ایک مکالمہ (رفتار کا بدن) ص ۴۹۳

پھر سرِ شاخِ شعاعِ خورشید نکہتِ گُل کا بسیرا ہو گا
آج پھر وسعتِ صحرائے جنوں پرسشِ آبلہ پا چاہتی ہے
اشارہ کرے جو نئی زندگی کا ہم اس خود کشی کو روا جانتے ہیں
شہرِ خلقِ خدا سے بیگانہ کارواں، میرِ کارواں سے دور
فکرِ تعمیرِ آشیاں بھی ہے خوفِ بے مہریِ خزاں بھی ہے
خاک بھی اُڑ رہی ہے رستوں میں آمدِ صبح کا سماں بھی ہے

ناصر کی شادی، جولائی ۱۹۵۲ء کو ہوئی۔ یہ ناصر کی خوش نصیبی تھی کہ انہیں صحیح معنوں میں ایک شریکِ حیات مل گئی۔ ان کی بیگم نے آتے ہی اپنے شاعر شوہر کی سبھی عادات سے سمجھوتہ کر لیا اور ان کی سچّی رفیق اور غمگسار ثابت ہوئیں۔

"جس نے عنصر کو بھی ماں کا پیار دیا۔ اور ہر حالت میں ان کی مرضی کے مطابق رہی۔ کبھی کسی قسم کا شکوہ شکایت نہیں کی کبھی انہیں پریشان نہیں کیا۔ ......۔ ناصر کی طبیعت کو سمجھ گئی اور قوم کی امانت سمجھ کر پروان چڑھاتی رہی۔ خدا نے دو بچّے دیئے۔ انہیں اللہ کی امانت سمجھ کر پالتی رہی۔ اور ان کی اعلیٰ تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہ چھوڑی"[1]

بیگم ناصر کاظمی نے ان کی پوشاک اور خوراک کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ وہ بے حد خوش لباس تھے۔ باہر جاتے ہوئے سوٹ یا شیروانی پہنتے اور گھر میں کھدر کا کرتا پاجامہ پہنتے۔ بعد میں کُرتے کے ساتھ شلواریں بھی سلوالی تھیں۔ کالج کے زمانے تک تو وہ اپنا بے حد خیال رکھتے تھے لیکن بعد میں اس طرف دھیان کم دینے لگے۔

۱؎ محترمہ صغریٰ بی بی - ایک تحریر

پھر بھی وہ اپنی پرانی جھلک ضرور دکھا دیتے۔ مثلاً سجاد باقر رضوی صاحب نے یہ دو واقعات بتائے کہ ایک بار ناصر ان کے پاس آئے تو بہت آزردہ دکھائی دیئے۔ وجہ پوچھی تو بولے۔ "سفید چمکتی ہوئی قمیص پہن کر آرہا تھا بس میں ایک شخص نے مجھے کندھا مارا اس کے پسینے سے قمیص کی سفیدی میں کمی آگئی۔ اسی لئے اُداس ہوں۔" پھر ایک بار ناصر سجاد باقر صاحب کو کسی مشاعرے میں لے جانے کے لئے ان کے گھر گئے۔ سجاد صاحب جلدی جلدی تیار ہوئے۔ اور پھر زمین پر رکھے لیمپ کا بٹن پاؤں سے دبا کر بند کر دیا۔ اس پر ناصر کاظمی بے حد خفا ہوئے اور کہا کہ "تمہاری اس حرکت سے رعونت ٹپکتی ہے۔ پھر کبھی اس طرح نہ کرنا۔" کھانوں میں بھی خوش خوراک اور باذوق واقع ہوئے تھے۔ بہت اہتمام سے کھانا کھاتے۔ خوب مصالحے دار اور خوش ذائقہ چیزیں نوش کرتے۔ ریڈیو پاکستان میں جب ملازمت کی تو صبح دفتر جاتے ہی اناناس کے رس کی فرمائش کرتے اور کہتے "Pine Apple Jucie" کہتے ہوئے میری زبان خاص لذّت محسوس کرتی ہے۔

بیگم ناصر کاظمی نے بتایا کہ بارش ہوتے ہی وہ باہر نکل جانے کو بے چین ہو جاتے اور کبھی چھتری لے کر اور کبھی بغیر چھتری ہی کے چلے جاتے۔ ہمیشہ یہی ہوا کہ جیسے ہی بوندیں پڑیں ان کی رم جھم کشاں کشاں ناصر کو گھر سے باہر کھینچ لاتی۔

یہ خواب سبز ہے یا رُت وہی پلٹ آئی
چھتوں پہ گھاس ہوا میں نمی پلٹ آئی

مینہ جو برسا تو برگ ریزوں نے
چھیڑ دی بانسری درختوں میں

پھر نئی نسل کے عنواں چمکے
ابر گرجا گُلِ باراں چمکے

پھر ساون رُت کی پون چلی تم یاد آئے
پھر پتوں کی پازیب بجی تم یاد آئے

پھر کاگا بولا گھر کے سُونے آنگن میں
پھر امرت رس کی بُوند پڑی تم یاد آئے

پہلے تو میں چیخ کے رویا اور پھر ہنسنے لگا
بادل گرجا بجلی چمکی تم یاد آئے

انہیں بسنت رُت بھی بہت عزیز تھی :

پھر کُونجیں بولیں گھاس کے ہرے سمندر میں
رُت آئی پیلے پھُولوں کی تم یاد آئے

گُنج گُنج نغمہ زن بسنت آگئی!
اب سجے گی انجمن بسنت آگئی
اُڑ رہے ہیں شہر میں پتنگ رنگ رنگ
جگمگا اُٹھا گگن بسنت آگئی
سبز کھیتیوں پہ پھر نکھار آگیا
لے کے زرد پیرہن بسنت آگئی

پچھلے سال کے ملال دل سے مٹ گئے
لے کے پھر نئی چبھن بسنت آگئی!

ناصر کے ہاں رات بھی ایک خاص کشش رکھتی تھی، بچپن میں ضرورت کے تحت جاگتے تھے لیکن اب رات انہیں خود جگانے لگی اور ناصر خود بھی نہ جان پائے کہ وہ جاگنے پر کیوں مجبور رہیں :

میں کیوں پھرتا ہوں تنہا مارا مارا | یہ بستی چین سے کیوں سو رہی ہے
رات بھر ہم نہ سو سکے ناصر | پردۂ خامشی میں کیا کچھ تھا

JAMIA HAMDARD LIBRARY New Delhi
MALHOTRA COLLECTION

"ناصر کا کہنا تھا کہ رات کا وقت تخلیق کا وقت ہے کہ کائنات رات ہی میں تخلیق ہوئی تھی۔ سو اس بستی کی راتوں کا کسی نہ کسی کو تو امین بننا تھا، کسی نہ کسی کو تخلیقی درد کو زندہ رکھنے کا فریضہ انجام دینا تھا۔ جب رات کا جادو جاگتا اور شہر کی ہر گلی سو جاتی اور خالی رستے بولنے لگتے تو وہ رات کا بے نوا مسافر گلی گلی گھومتا پھرتا دیکھا جاتا۔۔۔

ایک عرصے تک آخرِ شب کے راہگیروں نے، فٹ پاتھوں پہ بیٹھے ہوئے پان سگریٹ والوں نے رات کے سناٹوں میں اس زخمی آدمی کو اداس اداس پھرتے اور شعر گنگناتے دیکھا۔"[۱]

نیندیں بھٹکتی پھرتی ہیں گلیوں میں ساری رات
یہ شہر چھپ کے رات کو سوتا ہے آب میں

رات آتی، چاند نکلتا اور ناصر گھر سے باہر سڑکوں پر کھلے آسمان تلے کچھ سوچتے ہوئے چلتے چلے جاتے:

شام سے سوچ رہا ہوں ناصرؔ — چاند کس شہر میں اترا ہو گا
چاند نکلا اُفق کے غاروں سے — آگ سی لگ گئی درختوں میں
چلے تو ہیں جرسِ گُل کا آسرا لے کر
نہ جانے اب کہاں نکلے گا صبح کا تارا

اور آخر پو پھوٹ پڑتی:

خاک بھی اُڑ رہی ہے رستوں میں — آمدِ صبح کا سماں بھی ہے

بیگم ناصر کاظمی نے ناصر کی ایک عجیب عادت بتائی کہ دن کے وقت ان سے جو بھی سوال کیا جاتا اس کا جواب وہ اسی وقت نہ دیتے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ بچوں نے کچھ پوچھا تو

۱۔ انتظار حسین، "لفظ" اورینٹل کالج کا مجلہ ۳، ۴ دبرگِ نے، ص ۱۴۱۰

دن میں جواب نہ دیا اور رات کو سوتے بچوں کو جگا کر ان کے دوپہر میں پوچھے گئے سوالات کے جواب دیتے۔ رات کا بیشتر حصہ وہ باہر یا ٹی ہاؤس میں گزارتے۔ اگر کبھی گھر میں ہوتے تو تب بھی راتوں کو جاگتے رہتے اور گھر والوں سے کہتے کہ دروازے اور کھڑکیاں کیوں بند کرتے ہو۔ میں جو جاگ رہا ہوں۔ رات جاگنے کا مطلب یہ نہیں کہ انہیں نیند نہیں آتی تھی۔ ایسا بھی نہ تھا۔ صبح جب دفتر پہنچتے تو کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو جاتے۔ ان کے ایک دوست نے ان کے اس پوز میں کچھ تصویریں اتار لیں۔ ان تصویروں میں ایک ایسا انسان سمٹا سُکڑا، گہری نیند میں گُم دکھائی دیتا ہے جو کسی لمبے سفر سے تھک کر آیا ہو گھٹنوں کو بازوؤں میں سمیٹے گردن ایک طرف ڈھلکائے اس آدمی کے سامنے میز پر کاغذات کے ڈھیر رکھے ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہ تصویریں دیکھ کر لبوں پر ہنسی بھی کھیل جاتی ہے لیکن آنکھوں میں نمی بھی اتر آتی ہے۔ جی چاہتا ہے اس آدمی کو نرمی سے جگا کر پوچھیں تمہیں کس چیز کی تلاش ہے؟ .... تم راتوں کو کیا ڈھونڈتے پھرتے ہو؟ یہ جو چل چل کر تمہارے پاؤں تھک گئے ہیں، جاگ جاگ کر تمہاری آنکھیں سوج گئی ہیں تو اے شاعر تمہیں کیا دکھ ہیں؟ دکھ ہوتا ہے کہ یہ انسان جو شہزادہ ہے، یہ غموں اور پریشانیوں سے آزاد ہو کر پھولوں کی مسند پر سونے کی بجائے اس وقت دفتر کی ایک تکلیف دہ کرسی پر ڈھیر پڑا ہے۔ لیکن بات دراصل یہ ہے کہ معاشرہ شاعر کے خواب دیکھ کر خوش ہو جاتا ہے کہ یہ انسان بڑی کامیاب زندگی گزار رہا ہے ..... لیکن شاعر کی اصل زندگی کی تلخیوں اور کڑواہٹوں کو چکھنا تک برداشت نہیں کر سکتا ..... ایک حساس شاعر گُھل گُھل کر ختم ہو جاتا ہے لیکن اُسے اس سے کیا۔ جتنا شاعر گُھلے گا اتنے ہی چمکتے ہوئے شعر جگمگا اٹھیں گے ..... ناصر کو انسانوں نے مایوس کیا۔ معاشرے نے انہیں بے کار جانا، لیکن ان کے عزیز ترین دوست ان کے دکھ وقتی طور پر ہی سہی، چن چن کر فضاؤں میں اڑاتے اور ناصر کچھ لمحوں کے لئے خوش، پُر سکون اور مطمئن ہو جاتے۔ یہ دوست وہی بچپن کے ساتھی،

خوبصورت، اور معصوم کبوتر ہیں، جن کو ناصر بے حد چاہتے تھے گھر کی چوتھی منزل پر ان کبوتروں کے لئے ڈربے بنے ہوئے تھے۔ ان کے چھوٹے بیٹے حسن سلطان کاظمی نے اپنے بابا سے کہا کہ آپ البم میں کوئی تصویر لگا کر اس کا افتتاح کر دیں اور ان کے آگے تصویروں کا ڈھیر لگا دیا۔ انہوں نے سب تصویروں میں سے دو کبوتروں کی ایک ایسی تصویر چن کر البم کے پہلے صفحے پر لگا دی جس میں صبح کی کرنوں میں ڈربے دو کبوتر سرگوشیوں میں مصروف ہیں۔ ان کی بیگم نے بتایا کہ وہ خود بھی بہت اچھی تصویریں اتار لیتے تھے۔

ناصر کاظمی سفر کے بھی بہت شوقین تھے۔ بچپن میں گھڑ سواری کے شوق نے اس دوسرے شوق کو بھی پورا کیا لیکن شہر لاہور میں آکر گھوڑے پر سیر کہاں ممکن تھی۔ ویسے ناصر اتنے حقیقت پسند تو تھے کہ یہ کہہ سکیں:

"کس قدر غلط ہے اکے اور ریل گاڑی کا مقابلہ اور کس قدر دلچسپ ہے گھوڑے کے مقابلے میں ریل گاڑی کی وقعت اور اہمیت۔ جب ریل نہیں تھی تو کتوں اور گاڑیوں کا سفر خاصا بور تھا اس لیے ریل کی ضرورت تھی۔ اب کوئی لمبا سفر کرنا ہوتا ہے تو ٹکٹ لیا، ریل گاڑی میں بیٹھے اور چل دیے۔ مقصد منزل پر پہنچنا ہے نہ کہ مشاہدہ یا تجربہ .....

آجکل اتنی فرصت کہاں کہ ریل گاڑی میں فطرت کا مشاہدہ کرنے نکلیں۔ گھوڑے چھن گئے۔ اب تو ہم خود سفر کرتے ہیں۔ خوشبو کی طرح اڑتے پھرتے ہیں۔ گھوڑوں کو ریل گاڑی کے ساتھ نہیں دوڑاتے۔"[1]

لیکن سیر بہر حال نہ چھوڑی۔ وہ قدیم عمارتوں میں جانا بے حد پسند کرتے۔ شالیمار اور

---

[1] ناصر کاظمی۔ "سویرا" ۱۹-۲۰-۲۱ ایک مکالمہ (رفتار کا بدن) ص ۴۹۲

شاہی قلعے جاکر بے حد خوش ہوتے۔ موئن جودڑو گئے تو اسے بے حد دلچسپی اور بہت غور سے دیکھا اور بڑے شوق سے انہیں کھنڈروں کو پس منظر بنا کر تصویریں کھنچوائیں۔ وہ ہر سال کوہ مری جانے کی ہر ممکن کوشش کرتے۔ اس میں ایک پہلو تو سیر کا تھا اور دوسرا پہلو یہ کہ مری یہ جانا بھی بڑی شان والی بات لگتی تھی اور ایسے موقعے ناصر نے کبھی نہیں چھوڑے۔ بیگم ناصر نے بتایا کہ سفر بڑے اہتمام سے کرتے۔ انہوں نے بتایا کہ آخری بار ۱۹۷۰ء میں مری گئے۔ ۱۹۷۱ء میں تیار ہوئے لیکن بیگم ناصر نہ گئیں اس لئے ناصر بھی نہ جا سکے۔

طبیعت ضدّی تو تھی۔ جو جی میں آجاتا وہی کرتے تھے۔ عمدہ چیزیں خریدتے۔ چھوٹی چھوٹی لیکن خوبصورت چیزیں۔ ناصر کے قریبی دوست شیخ صلاح الدین صاحب نے بتایا کہ ناصر سے جب کوئی کام کروانا ہوتا تو اُسے چیلنج کر دیا جاتا کہ تم یہ کام نہ کر سکو گے اور وہ ضد میں آکر وہی کام ضرور کرتا۔ ''امریکن سوسائٹی'' ایک کتاب جس میں ادب، فلسفہ، معاشیات اور سوشیالوجی وغیرہ پر مضامین ہیں، اس کے ترجمے کی بات چھڑی تو ناصر نے اس کے ترجمے کی حامی اس لئے بھر لی کہ یہ ایک مشکل کتاب تھی۔ شیخ صاحب نے کہا کہ جب مجھے ناصر کو کوئی اچھی کتاب پڑھوانا ہوتی تو میں پہلے کتاب کی تعریف کرتا اور پھر کہتا ''تم بھلا کیسے پڑھو گے یہ کتاب، رہنے دو، تم نہیں پڑھ سکتے اور پھر کتاب جان بوجھ کر ناصر کے پاس بھول آتا اور ناصر وہ کتاب نہ صرف پڑھتا بلکہ بحث پر آمادہ ہو جاتا۔ شیخ صاحب نے ان کے ایک عجیب طرزِ عمل کا ذکر بھی کیا کہ جیب میں پیسے بھی ہوتے تو کتاب نہ خریدتے کہ کون جیب میں ہاتھ ڈالے کہ رقم ادا کر کے کتاب حاصل کرے۔ انہوں نے بتایا کہ ''میں نے ۱۳۶ مختلف کتابیں ناصر کو دیں۔ ان کی فہرست میرے پاس موجود ہے۔ میں نے ناصر کا امتحان بھی لیا۔ پھر کچھ کتابوں پر خود ناصر کے تحریر کردہ نوٹس بھی درج ہیں۔''

ناصر کو ہر طرح کے آدمیوں سے دوستی کا شوق تھا اور وہ یہ دوستیاں نبھاتے بھی تھے۔ بڑے بڑے افسروں سے لے کر مزدوروں تک سے ان کی دوستی تھی اور سب انہیں بے حد

چاہتے تھے۔ یہی چاہیے جاتا تو انہیں زندہ رکھے ہوئے تھا۔ ورنہ یہ حساس شاعر ناموافق فضا اور حالات میں اپنے آپ کو وقت سے اور بھی پہلے ختم کر لیتا۔ ناصر کی دوستیاں شروع کس طرح ہوئی تھیں۔ ایک مثال یہ ہے کہ ناصر نے اپنے ٹی۔ وی انٹرویو میں یہ واقعہ سنایا کہ بارش بہت ہو رہی تھی اور تانگے والا بارش میں کرشن نگر نہ جاتا تھا جہاں معمولی بارش سے بھی سڑکیں زیر آب آجاتی ہیں۔ آخر اسے جب معلوم ہوا کہ ناصر شاعر ہیں تو بولا کوئی شعر سناؤ۔ اور ناصر کے یہ شعر سنانے پر نہ صرف تانگے والا راضی ہو گیا بلکہ کہا۔ "ابے لونڈے تیرا یہ شعر ہے۔ آ بیٹھ تانگے میں ساری عمر مفت لے جاؤں گا" اور واقعی تادم آخر وہ انہیں مفت لے جاتا رہا۔ شعر یہ تھا:

واقعہ یہ ہے کہ بدنام ہوئے　　　بات اتنی تھی کہ آنسو نکلا

ناصر کی پسندیدہ شخصیتوں میں سے کچھ یہ ہیں۔ میر، فراق، میرا بائی، آزاد، ناصر کے یہاں وہ تعصب بالکل نہیں جس کے تحت عورت ذات کو مردوں سے کم عقل کہا جاتا ہے بلکہ انہیں میرا بائی کے بھجن میں وہ حسن نظر آیا جو اور کہیں نہ ملا۔ انہیں انگریز شاعر ایڈتھ سیٹ ویل بھی عزیز ہے۔ میر سے ان کی دوستی کو سبھی جانتے ہیں۔ محمد حسین آزاد سے ان کی دلچسپی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی میز پر ہر وقت "آبِ حیات" رکھی رہتی تھی۔

ناصر اپنے دکھ اپنے اندر اتارتے چلے گئے۔ غموں نے انہیں اندر سے کھوکھلا کر دیا۔ وہ بیمار رہنے لگے۔ شراب وہ پیتے تو تھے لیکن اتنی زیادہ نہیں جو ان کی صحت کو اس حد تک خراب کر دیتی۔ دراصل بہت زیادہ حساس شاعر اور وہ بھی رومانوی مزاج رکھنے والا اس دنیا میں بہت کم عرصہ زندہ رہ سکتا ہے۔ یہ لوگ سائے میں اُگنے والے پودے اور دھند میں کھلنے والے پھول ہوتے ہیں جو سورج کی کرنوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ پھر یا تو جھلس جاتے ہیں یا مرجھانا شروع کر دیتے ہیں۔ اور ناصر بھی مقابلے

کا حوصلہ رکھنے کے باوجود جھلسنے لگے اور مرجھانے لگے۔

ان کے عزیزوں کو بتا دیا گیا تھا کہ انہیں سرطان جیسا مہلک مرض ہے لیکن ناصر کو خبر نہ ہونے دی گئی اور ناصر یہ احساس ہونے کے باوجود کہ ان کے اندر ایک گہرا اندھیرا پھیلتا جا رہا ہے کہتے رہے کہ میں زندہ رہوں گا۔۔۔ اور یہ بھی کہا کہ میں دوبارہ آؤں گا۔ ناصر کو اس دنیا نے کیا دیا میٹھے خوابوں کی کڑوی تعبیریں۔ لیکن امید تو تھی جو پھر نئے خواب دکھاتی تھی۔ "یہی فن کار کا کام ہے کہ وہ انسان کے دل کو جو حُسن سے جیتا ہے، جو خوشی چاہتا ہے اس دور میں بھی جب حُسن نہیں ہے، خوشی نہیں ہے، دل کو مرنے نہ دے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ کمال ناصر کو بہ تمام خوبی حاصل تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔

"۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سوال یہ ہے کہ ناصر کے ساتھ جو کچھ بیتی وہ کیوں بیتی اور کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم حالات کو ایک ایسا رُخ دیں کہ اگر ناصر کے لئے اچھے حالات نہ پیدا ہوئے تو وہ جو اس نے اپنی خوش خبری دی تھی، کہ اے سرزمینِ وطن میں پھر آؤں گا، اور تیری آنے والی نسلوں کے لئے کسی نہ کسی روپ میں خوشیوں کے گیت گاؤں گا۔۔۔۔۔ تو کم از کم اس وقت حالات کچھ بہتر ہو چکے ہوں"[1]

یوں غزل کو اپنے خونِ جگر سے مسیحائی دینے والا شاعر قریب المرگ ہو گیا۔ تب سبھی کو احساس ہوا کہ ان سے کوئی متاع چھنی جا رہی ہے۔ سبھی بھاگے آئے۔ جلوس نکالے گئے۔ حکومت نے توجہ کی۔ ٹی۔ وی انٹرویو ہوئے۔ دوست احباب نے مدد دی۔ لیکن بھلا بُجھ چکنے والے چراغ کی لَو کی آخری لرزش کب تک ٹھہری رہ سکتی ہے۔ اتنا ضرور ہوا کہ بالکل آخری لمحات میں کچھ نہ کچھ سکون ضرور مل گیا۔

---

[1] محمد حنیف رامے۔ رسالہ "کتاب" اپریل ۷۴، ۱۹ء ایک خطبہ (ناصر کاظمی۔ اُداس نسلوں کا شاعر) ص۔ ۱۲

ناصر نے جنگِ دسمبر میں کئی ترانے لکھے۔ اور جب سقوطِ ڈھاکہ ہوا تو ناصر بے اختیار رو دیئے۔ ان کے بیٹے باصر نے بتایا کہ وہ اس واقعہ پر اتنا زیادہ روئے تھے کہ ہم حیران رہ گئے۔ واقعی بہادر لوگوں کے آنسو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ لیکن کیا ناصر نے کبھی تنہائیوں میں آنسو نہ بہائے ہوں گے۔ ضرور ان کی پلکیں نم رہی ہوں گی لیکن انہوں نے اپنے دکھ کسی پر ظاہر نہیں کیے، کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا۔ بھلا بہادر شہزادوں کو یہ زیب دیتا ہے؟ بس اگر ناصر پھر کسی کے سامنے روئے تو اپنی موت سے چند گھنٹے پہلے۔

"میں ان چند لمحوں کو اپنی عزیز یادوں کے سرمائے میں داخل کر چکا ہوں جو یکم مارچ کو میں نے اس کے ساتھ بسر کیے۔ میں البرٹ وکٹر ہسپتال پہنچا تو ناصر کے پاس سجاد باقر رضوی تشریف فرما تھے۔ میں اس کے پاس صرف ایک گھنٹہ بیٹھا۔ اس دوران ناصر مسلسل بولتا رہا۔ سانس کی تکلیف کی شکایت کی۔ گھر جانے کی اجازت کی تمنا ظاہر کی۔ پھر اُس نے خلوص و محبت کے اُن بے بہا جذبات کا اظہار کیا جن میں زندگی بھر کوئی رخنہ نہیں پڑا تھا۔ دوسرے شاعروں کے اشعار کی طرح اسے میرے بھی سینکڑوں شعر یاد تھے۔ اور اس روز بھی اپنی موت سے صرف بارہ تیرہ گھنٹے پہلے وہ میرا ایک ایسا شعر پڑھ رہا تھا جو شاید ابھی کہیں چھپا بھی نہیں مگر میں نے اسے کسی طویل سفر کے دوران سنایا ہوگا۔ میں اس احساسِ تفاخر کے ساتھ اپنا یہ شعر پیش کرتا ہوں کہ ناصر اسے اپنی زندگی کے آخری روز پڑھ رہا تھا اور رو رہا تھا۔ شعر یہ تھا:

مرے نصیب میں بنجر زمیں کی رکھوالی
کنویں اُداس مرے، کھیت بے ثمر میرے

یا تو اس شعر میں ناصر کو اپنے پورے سوانح دکھائی دے رہے تھے یا وہ اس طرح بھی مجھ سے اپنی محبت کا اظہار

کر رہا تھا۔ مگر وہ شعر پڑھتے ہوئے رو کیوں رہا تھا؟ پھر جب
میں نے اس سے اجازت چاہی اور اس کے دونوں
ٹھنڈے ہاتھوں سے اپنے دونوں گرم ہاتھ ملائے تو اس
نے میرے ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لیئے اور
یہ ہاتھ ناصر کے آنسوؤں سے بھیگ گئے۔ اُس
وقت میں اگر وہاں ایک لمحہ بھی رُکتا تو بچّوں کی طرح
رو دیتا۔"[1]

اور بالآخر ناصر اپنی زندگی کی آخری رات بھی جب جاگ چکا تو صبح ہوتے ہی اسے پھر نیند آگئی لیکن یہ ایسی نیند تھی جس سے جاگنا پھر ناصر کے اپنے اختیار میں بھی نہ تھا۔ اور ناصر یہ کہتا ہوا رخصت ہو گیا: "میرا اسلام کہیئے۔ لاہور شہر کے نواح سے، دوستوں سے، قہوہ خانوں سے، درختوں سے، چڑیوں سے، پرندوں سے۔"[2]

اور جب ناصر چلا گیا تو ناصر پر لکھے گئے مضامین سے اخبارات و رسائل بھر گئے۔ تب سب کو معلوم ہوا کہ کتنا بڑا شاعر اس دنیا سے چلا گیا۔ سب کو اپنی اپنی زیادتیاں یاد آئیں لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ شہزادہ تو پہلے ہی اپنی غزلوں میں اپنے جانے کی خبر دے چکا تھا۔ اشارہ کر چکا تھا کہ میں جا رہا ہوں۔ مجھے روکنا چاہتے ہو تو روک لو۔ لیکن اس وقت تو سب نے صرف شعر کی داد دی۔ یہ نہ دیکھا کہ شعر میں ایک شاعر نہیں بول رہا ایک جیتا جاگتا انسان

---

[1] احمد ندیم قاسمی ، "فنون" اپریل مئی ۱۹۷۲ء (ناصر کاظمی کی یاد میں) ص ۔ ۲۸
[2] ٹی ۔ وی ۔ انٹرویو

اپنے مرجانے کو محسوس کر رہا ہے :

آیا گیا نہ میں کہیں، صبح سے شام ہو گئی
جلنے لگے ہیں ہاتھ کیوں ٹوٹ رہا ہے کیوں بدن

رنگ پیلا ہے تیرا کیوں ناصرؔ　　تجھے کیا رنج کھائے جاتا ہے

اور آخر کار :

وہ ہجر کی رات کا ستارہ وہ ہم نفس ہم سخن ہمارا
سدا رہے اس کا نام پیارا سنا ہے کل رات مر گیا وہ
مجھے تو خیر وطن چھوڑ کر اماں نہ ملی
وطن بھی مجھ سے غریب الوطن کو ترسے گا
رقم کریں گے تیرا نام انتسابوں میں
کہ انتخاب سخن ہے یہ انتخابوں میں

پھر ناصر کا کلام "دیوان" کے عنوان سے چھپا جس کے سرورق پہ ایک سفید اور معصوم کبوتر اپنے چاہنے والے کو ڈھونڈھ رہا ہے۔ "دیوان" کو آدم جی ادبی انعام بھی ملا۔ مگر اس وقت ناصر جا چکے تھے۔ البتہ ان کی غزل زندہ تھی اور وہ سدا زندہ رہے گی۔ مسیحاؤں کے معجزوں کو زوال نہیں آیا کرتا۔ ناصر بھی یہ جانتے تھے۔ اسی لئے تو انہوں نے کہا تھا :

ہر دور کی غزل میں میرا نشاں ملے گا

(دوسرا باب)

اردو غزل * قیامِ پاکستان تک

اُردو غزل کی ابتدا صحیح معنوں میں عملاً ولیؔ سے ہوئی اور پھر غالبؔ تک اُردو غزل مسلسل ارتقا پذیر رہی۔ ولیؔ سے غالبؔ تک کے عرصے میں برِصغیر پاک و ہند کی سیاسی حالت بہت پراگندہ رہی۔ بادشاہ جو عوام کے جان و مال کی حفاظت کے ذمہ دار ہوتے ہیں کچھ اپنی نا اہلی اور کچھ اپنی مجبوریوں کی وجہ سے اپنے فرائض سے دست کش سے ہو گئے اور یوں باہر کی دنیا سے فرار حاصل کر کے اپنی ذات کے اسیر ہو گئے۔ ہر قسم کی برائیوں کے پھولنے پھلنے کا یہ سنہری موقع تھا۔ چنانچہ ہر امکانی خرابی نے اس موقعے سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی زندگی انتشار کی نذر ہو گئی۔ یہ صورتِ حال اندرونِ ملک بغاوتیں برپا کرتی ہے اور بیرونِ ملک سے حملہ آوروں کو شہ دیتی ہے، سو یہی ہوا۔ اور شاعر جو امن اور حسن اور توازن کا رسیا ہوتا ہے، اپنے گرد و پیش کے یہ حالات دیکھ کر دکھی ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ میرؔ درؔد بھی اُداس رہے، میرزا سوداؔ بھی پریشان رہے، اور میر تقی میرؔ کی غزل کو تو دل اور دلّی کا مرثیہ کہنا چاہیئے۔ میرؔ جو اپنے سماجی حالات کو ان کی تہ تک اتر کر محسوس کرتے ہیں، کیسے غم زدہ نہ ہوتے۔ اپنے زمانے میں معیاروں کی شکست کو انہوں نے عشق کی ناکامی سے مربوط کر دیا۔ میرؔ کے نظریۂ حیات کی نمائندگی ان کا یہ شعر پوری طرح کرتا ہے۔ بظاہر اس شعر میں دنیا کی بے ثباتی کا رونا ہے مگر غور

سے دیکھئے تو حُسن کا بھی اثبات ہے اور اس تغیر کا بھی جس کا دوسرا نام ارتقا ہے کہ جب گُل مرجھاتا ہے تو کلی اس کی جگہ لینے کو موجود ہوتی ہے :

کہا میں نے کتنا ہے گُل کا ثبات　　　　کلی نے یہ سُن کر تبسّم لیا

میرؔ کی غزل نے اُردو غزل کو غلط راہ پہ جانے سے روک لیا اور اس کے انتشار کو سمیٹا۔ میرؔ ہی کے ہاں آکر اُردو غزل کا وہ مزاج متعین ہوا جو آج اس کا ناگزیر حصّہ ہے۔ میرؔ کی آنکھیں بیشتر پُرنم ہی رہیں لیکن وہ مسکرانے کی خواہش سے دست کش نہیں ہوئے تھے۔ ع ”وصل اس کا خدا نصیب کرے“ یہ خواہش پوری نہ ہو سکی اور میرؔ کو مسرّت کے ترانے گانے کا موقع نہ مل سکا۔ مزاج مزاج کی بات ہے۔ غالبؔ بھی تقریباً ایسے ہی حالات میں رہے۔ ان پہ بھی مادی اور جذباتی ایسے گزرتے رہے مگر انہیں مستقبل پر غیر معمولی اعتماد تھا۔ انہوں نے جل چکے جسم کے بھوبھل میں کچھ چنگاریاں دیکھ لی تھیں۔ تب ہی تو راکھ کو کریدنے کا شغل جاری رکھا۔ وہ جب یہ کہتے ہیں کہ ع ”دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی“ تو یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ انہوں نے امید و رجا کی شمع کو بجھنے نہ دیا۔ تب ہی تو انہوں نے اتنے اعتماد سے اس تمنا کا اظہار کیا تھا کہ

ے　کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب
اک آبلہ پا وادیٔ پُرخار میں آوے

انہیں یقین تھا کہ یہ ”آبلہ پا“ آئے گا۔ بس عزمِ راسخ کی ضرورت ہے اس لیے کہ ع توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے۔

غالبؔ تغیّر اور جدّت سے خائف نہیں تھے بلکہ دلدادہ تھے۔ انہیں جب دُور دُور تک کھنڈروں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا تو انہوں نے ان کھنڈروں میں ہی نئے چراغ جلا دیئے اور ان کی اونچی رقصاں لووں کی روشنی میں جہاں پرانے پن کی خوبیاں اور

خامیاں نمایاں ہوئیں وہیں نئے پن کی اچھائیاں بھی اجاگر ہونے لگیں۔ غالبؔ نے غزل کو نئے موضوعات کی مدد سے بہت وسعت دی اور اپنی جدت پسند طبیعت کی وجہ سے اظہار و بیان میں بھی تازگی پیدا کی۔ فتح محمد ملک کہتے ہیں: "غالبؔ ہماری فکری اور تہذیبی تاریخ کے اس نازک مرحلے پر نمودار ہوئے جب ہمارے ذہن میں قرونِ وسطیٰ کے دھندلکوں سے عہدِ جدید کی روشنیوں کی طرف قدم بڑھانے کی کشمکش برپا تھی۔ تاریخی اور تہذیبی ماحول کی نسبت سے غالبؔ کے فنی اور فکری نشوونما کا خیال کرتا ہوں تو مجھے غالبؔ کے کارنامۂ فن اور ان کے ہم عصر علمائے دین کی اصلاحی اور انقلابی جدوجہد میں ایک خاص ربط نظر آتا ہے۔ اس اعتبار سے غالبؔ کی شاعری اس عہد کے ہندی مسلمانوں کے اجتماعی دینی اور سیاسی فکر و عمل کا فنی اور جمالیاتی تکملہ ہے[۱]"

غالبؔ نے اُردو غزل میں فکر و شعور کی گہرائی شامل کی اور یوں غزل کے وقار میں استحکام پیدا کیا۔ یہ فکر انگیز اشعار غالبؔ کی قومی شخصیت کی عکاسی کرتے ہیں:

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت
نقشِ پا میں ہے تپِ گرمیِ رفتار ہنوز

غالبؔ کے یہاں انسانی نفسیاتی گہرائیوں کے عکاس شعر بھی ہیں:

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا
افسونِ انتظار، تمنّا کہیں جسے

---

[۱] فتح محمد ملک "تعصبات" (غالبؔ کے بغیر)، ص ۱۹۰

ہو کے عاشق وہ پری رخ اور نازک بن گیا
رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اُڑتا جائے ہے

"غالبؔ انسان کے بنیادی اور بعض صورتوں میں دوامی جذبات و احساسات کا شاعر ہے اور اس نے جذبہ و احساس کو دانش و ادراک پر یا دانش و ادراک کو جذبہ و احساس پر قربان نہیں ہونے دیا۔ یوں اس کے ہاں رومانیت اور حقیقت کا بے حد متوازن اور دلآویز امتزاج ہے"[1] غالبؔ آج کے (اور آئندہ آنے والے) شعرا کا سب سے پہلا رہنما ہے اور جس انداز کی غزل کو جدید غزل کہا جاتا ہے اس کی مضبوط ترین بنیادیں غالبؔ نے ہی اٹھائی تھیں لیکن ۔ ۔ "غالبؔ کی جدید غزل نے جو روایت قائم کی تھی اس کا تسلسل ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد اس بری طرح ٹوٹا کہ حالیؔ تک مطلع قریب قریب صاف نظر آتا ہے"، بلکہ "ایسا محسوس ہوتا کہ داغؔ، امیرؔ اور ان کے شاگردوں اور متاثرین کی غزل دراصل غالبؔ کی غزل کا ردِعمل تھی"[2]۔ حالیؔ نے خود کہا کہ "فی زمانہ غزل کی حالت نہایت ابتر ہے۔ وہ محض ایک بے سُود اور دور از کار صنف معلوم ہوتی ہے"[3]۔ حالیؔ اُردو غزل کے "حال" سے مایوس نظر آتے۔ یوں تو ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی حیرت درست ہے کہ "جس نے میرؔ اور غالبؔ کی غزلیں پڑھی اور دیکھی ہوں اس کا غزل کے امکانات سے مایوس ہونا سمجھ میں نہیں آتا"[4] لیکن یہ بھی تو دیکھنا چاہیئے کہ حالیؔ کو غالبؔ جیسی پُرعظمت شخصیت کی جگہ لینے والا کوئی شاعر

۱؎ احمد ندیم قاسمی (حرفِ اوّل) "فنون" "غزل نمبر" ۶۹ء۔ ص ۱۶

۲؎ احمد ندیم قاسمی (حرفِ اوّل) "فنون" "غزل نمبر" ۶۹ء۔ ص ۱۶

۳؎ الطاف حسین حالی۔ "مقدمہ شعر و شاعری"

۴؎ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ "غزل اور متغزلین" ص ۶

آگے بڑھتا محسوس نہ ہوا بلکہ اس وقت کے شاعر تو غالبؔ کے ردِ عمل میں غزل کے قدیم ترین کلاسیکی رنگ کو بغیر کسی واضح جدّت کے اضافے کے اپنائے ہوئے تھے۔ پھر اس وقت ہندوستان غلام بنا سر جھکائے کھڑا تھا۔ اور یہ یہاں کے لوگوں کے لئے ایک بہت بڑا دکھ تھا۔ جسے یقیناً حالیؔ نے محسوس کیا، جو فطرتاً سوز و گداز کے مالک شاعر تھے۔ حالیؔ کو اس وقت دو کام کرنا تھے۔ ایک تو بکھرتی ہوئی تہذیبی روایت کو جوڑنا اور دوسرے نئے قدموں کی چاپ سننا اور سنانا۔ لیکن چونکہ وہ کوئی ایسی مضبوط بنیاد نہ پا رہے تھے جس پر وہ مشکلات کے حل تعمیر کر سکتے اس لئے انہیں جب بھی اپنی حیران، ڈھونڈتی سوچ کو کوئی چھوٹا سا سہارا بھی ملتا دکھائی دیا وہ وہیں رک گئے اور آخر سر سید کے زیرِ سایہ جا پہنچے۔ جس بات کی سر سید نے خواہش کی اُسے پورا کرنے کی اپنی سی کوشش کرتے رہے، چاہے اس کے لئے انہیں اپنے مزاج اور فطرت کی قربانی ہی کیوں نہ دینا پڑی۔ یوں حالیؔ نے اصلاحِ غزل کی تحریک شروع کی۔ حالیؔ چاہتے تھے کہ "شاعری جھوٹے اور رسمی جذبات سے ہٹ کر واقعیت اور حقیقت کی طرف لوٹ آئے"۔[۱]

حالیؔ کے نزدیک غزل کو صرف حُسن و عشق کے معاملات کی حدود ہی میں نہیں رہنا چاہیئے بلکہ غزل کو کچھ اور خیالات اور کچھ اور مضامین کے ذریعے وسعت دینا چاہیئے۔ حالیؔ کی اصلاحِ غزل کی "تحریک کا سب سے بڑا کارنامہ (یہی) ہے کہ اس طرح اس نے غزل کو موضوع اور طرزِ ادا دونوں اعتبار سے وسعت دی"۔[۲] حالیؔ نے جو کچھ کہا اس پر اپنی غزلوں میں عمل کرنے کی بھی کوشش کی اور احساس دلایا کہ:

۱؎ فیض احمد فیض ... "میزان" (حالیؔ اور نظیرؔ) ص - ۱۰۰

۲؎ ڈاکٹر عبادت بریلوی "غزل اور مطالعۂ غزل"، ص - ۳۸۱

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

لیکن وہ خود انسانی فطرت کے ایک بہت مہذّب جذبے یعنی محبت سے آنکھ چرا کر گزر نہ سکے، اس لئے کہ ہزار مصلحتوں کے باوجود:

ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

اور اپنے جذبات پر زبردستی کا پہرا لگا کر حالی نے اپنی رچی ہوئی، سادہ اور سلیس غزل کو واعظانہ انداز کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش میں اپنی غزل کو نقصان ہی پہنچایا:

بڑھاؤ نہ آپس میں ملّت زیادہ
مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ

حالی کا مقصد نیک تھا لیکن وہ اس کے اظہار کا مناسب طریقہ نہ اپنا سکے اور ان کی غزل اعلیٰ شاعری کا نمونہ نہ بن سکی۔ البتہ اس سے کسی کو انکار نہیں ہوگا کہ حالی نے نہ صرف اپنے زمانے کے حالات کے تقاضے کے مطابق بلکہ شاید لاشعوری طور پر غالب کے مخصوص نئے پن کو آگے بڑھانے کی کوشش میں اُردو غزل کی روایت پر اپنی غزل سے جدیدیت کی روشنی پھینکی اور غالب ہی کی طرح حالی نے بھی یہ ضرور ثابت کیا کہ "نئے تصورات اظہار کے لئے نئے الفاظ اپنے ساتھ خود لاتے ہیں"[1]:

یوں بے سبب زمانہ پھرتا نہیں کسی سے
اے آسماں کچھ اِس میں تیرا بھی ہے اشارہ

---

[1] امین راحت چغتائی۔ "فنون" غزل نمبر ۶۹ء (اب دہی حرف جنوں۔۔۔) ص۔ ۲۳۲

اُس کی بے پروائیوں پر جا نہیں کیا
آؤ لیں اُس کو ہمیں جا کر منا

تھا کچھ نہ کچھ کہ پھانس سی اک دل میں چبھ گئی
مانا کہ اُس کے ہاتھ میں تیر و سناں نہ تھا

آگے بڑھے نہ قصۂ عشقِ بتاں سے ہم
سب کچھ کیا مگر نہ کھلے راز داں سے ہم

کی بھی اور کسی سے آشنائی کی
دھوم بھی اپنی پارسائی کی

اُردو غزل حالی سے ہوتی ہوئی اقبال تک پہنچی تو وہ داغ، امیر، اکبر اور چکبست سے آشنا ہو کر آئی تھی۔ جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد جو دہلوی اور لکھنوی رنگ یکجا ہوا اس کی نمائندگی داغ کے حصے میں آئی۔ داغ نے اپنا ایک خاص انداز اور لہجہ بنایا۔ انہوں نے حُسن و عشق کے معاملات میں شوخی اور شگفتگی کے ساتھ ساتھ ایک سنبھلی ہوئی کیفیت اور ستھرے اندازِ نظر کو اپنایا۔

"داغ نے ایک زوال پذیر معاشرے میں پرورش پائی۔ پھر انہیں جو فارغ البالی تمام عمر میسّر رہی اس کی وجہ سے بھی کوئی اہم مقصد اُن کے سامنے نہ رہا۔ اس لئے ان کے کلام میں گہرائی نہ پیدا ہو سکی۔" داغ بڑے شاعر نہیں ہیں مگر ایک معنی میں بڑے کھرے شاعر ہیں۔ یعنی نہ ان کے دل میں چور ہے، نہ ان کے دماغ میں لکنت۔[۱] اس وقت کے دوسرے شاعر امیر نے اپنی شاعری کی ابتدا لکھنوی ماحول میں کی لیکن پھر وہ

۱؎ ڈاکٹر خورشید الاسلام۔ غزل نمبر "نقوش" ۹۶ء "ذکر اس پری وش کا" ص۔ ۳۰

بھی داغؔ کے زیرِ اثر آ گئے لیکن کسی نئے تجربے کے بغیر حرفِ اظہار کی خوبی سے غزل کا ارتقا جاری نہیں رہ سکتا۔ انہی شاعروں اور متاثرین کی غزل کے ردِعمل میں حالیؔ نے غزل کی اصلاح کی ضرورت محسوس کی تھی۔

اکبرؔ اور چکبستؔ، حالیؔ کی جدّت پسندی کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے اپنے انداز میں غزل کی روایت کو بھی اپنایا اور اس میں نئے موضوعات کا کامیابی سے اضافہ کرنے کی کوشش بھی کی۔ اکبرؔ کے مدِّنظر تہذیبی اور معاشرتی مسائل تھے اور انہوں نے ان مسائل کو کہیں سنجیدہ مگر طنزیہ اور مزاحیہ انداز میں روایت کو سامنے رکھتے ہوئے نظم کیا۔ چکبستؔ کی غزل حُسن و عشق کے معاملات کی شاعری نہیں بلکہ اس میں قومی اور ملکی مسائل کا ذکر ہے مگر انہوں نے غزل کی روایت کو نہ چھوڑا۔ البتہ وہ اظہار و بیان کا کوئی نیا تجربہ نہ کر سکے۔

اس مرحلے پر اقبالؔ سامنے آئے جنہوں نے غالبؔ کی غزل کی روایت کو اپنا کر اس کو نئے تجربات سے بھی متعارف کرایا اور اُردو غزل کے ہاتھ میں ایک ایسی مشعل بھی تھما دی جس کی روشنی اُن کے بعد آنے والے طویل زمانوں تک چمکتی چلی جائے گی۔ اقبالؔ کو بھی غالبؔ ہی کی طرح زندگی کو پہچاننے اور اسے قریب سے دیکھنے کا شغف تھا۔ اور انہوں نے ہر دم رواں اور متحرک زندگی کے ایک ایک پہلو ایک ایک جھلک کو بڑے ذوق و شوق سے دیکھا۔ اور پھر اس کے مسائل کے حل تلاش کرنے میں منہمک ہو گئے۔ غالبؔ نے اُردو غزل کو فکر دی اور اقبالؔ نے اس فکر کو فلسفے کی روشنی دے کر اسے وسعت سے ہم کنار کیا۔ داغؔ کا شاگرد ہونے کے ناتے سے شروع شروع میں اقبالؔ پر روایت کے اثرات رہے لیکن اصل میں "اقبالؔ، داغؔ کی طرح نہ تو صرف محض شاعر تھے اور نہ حالیؔ کی طرح مانگے تانگے کی عقل پر گزارا کر رہے تھے بلکہ وہ اپنے عہد کے بلند ترین فکری، سائنسی اور ادبی معیاروں

کو اپنی فنی شخصیت کا جزو بنا کر قوم کی فکری و عملی زندگی میں ہمہ گیر انقلاب دیکھنے کے آرزومند تھے"[1] اور چونکہ اقبالؔ کی شاعری ایک مسلسل ارتقائی عمل ہے اس لئے شعور کے پختہ ہونے کے ساتھ ساتھ اقبالؔ اُردو غزل کی روایت میں اپنے مزاج سے مطابقت رکھنے والے رنگوں کا اضافہ کرتے رہے۔ انہوں نے اُردو غزل کے سانچوں سے مکمل طور پہ بغاوت نہیں کی بلکہ کلاسیکی طرز میں سے خوبصورتی کو چن لیا اور اس کو نئی معنویت اور نیا شعور بخشا۔" اقبالؔ کی بڑائی یہ ہے کہ اپنی تخلیقی کاوشوں کی تہذیب میں روایت سے پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے، اسے نئی فکری رفعتیں عطا کی ہیں اور تیشۂ تصور سے موجودات اور مابعد الطبیعات دونوں پہاڑ تراش کر عاشق کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔۔۔ اقبالؔ۔۔۔ غزل کے بنیادی جذبہ یعنی عشق کو قبول کر لیتے ہیں لیکن اسے متصوفانہ انفعالیت کے بجائے ایک فعال طاقت کا روپ دیتے ہوئے محرک کائنات کے محرک تصور انقلاب آفرینی کا مظہر بنا دیتے ہیں"[2] اور اس طرح اقبالؔ کی شاعری کے آئینے میں زندگی اور جمالِ زندگی منعکس ہونے لگتے ہیں اور اقبالؔ کی شاعری پڑھتے ہوئے ہمیں احساس ہوتا ہے کہ :

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کن فیکوں

شمس الرحمٰن فاروقی کہتے ہیں کہ " اقبالؔ نے اُردو نظم کی زبان یکسر بدل دی لیکن ان کا بہترین جوہر نظم ہی میں صرف ہوا۔ غزل کو انہوں نے اپنے بہترین لمحے کم کم ہی دیئے" اور " اقبالؔ بہت بڑے شاعر تھے اس لئے انہوں

---

[1] فتح محمد ملک، " تعصبات"، (غزل اور نئی غزل)، ص ۱۴۷

[2] ڈاکٹر حنیف فوق، "فنون" غزل نمبر ۶۹ء (اُردو غزل کے نئے زاویے)، ص ۸۱-۸۲

نے چند اچھی غزلیں بھی کہیں"[1] حالانکہ اسی بڑے شاعر کے "کم کم لمحوں کی توجہ" ہی نے "اُردو غزل کو نیا لہجہ، نیا آہنگ اور نئے تلازمات بخشے..... ان سب کا تعلق ایک طرف غزل کی روایت سے مستحکم طور پر قائم ہے اور دوسری طرف اظہار کا یہ سرمایہ اپنے دور کی اجتماعی حقیقتوں کی بڑے والہانہ انداز میں تشریح و تعبیر کرتا ہے"[2] پھر ویسے بھی اقبالؔ نے تو "نظموں میں بھی اپنی نے نوازی کی طرف اشارہ کیا تو اسے غزل ہی سے منسوب کیا:

میں کہ مری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو"[3]

اور اقبالؔ کی نظموں سے قطع نظر اگر خالص ان کی غزلوں سے ان کا پیام ترتیب دیا جائے تو جب بھی اس خوبصورتی، صفائی اور مردانہ جلال و جمال کے ساتھ غزل کے آئینے میں ان کے مردِ مومن کے خدوخال واضح ہو جاتے ہیں"[4]

اقبالؔ پہلے بڑے شاعر تھے جنہوں نے نہ صرف قومی، ملکی، سیاسی اور اقتصادی مسائل پر کھل کر لکھا بلکہ انہوں نے اپنے مذہب یعنی اسلام کے سمندر کی وسعت کو خود محسوس کیا اور اسی احساس کی سرشاری نے انہیں وہ گہرائی اور وسعتِ دل و دماغ عطا کی جو ان کی شاعری کی دنیا میں انسانیت پر اعتماد اور انسان کا احترام کرنے اور اس کے ارتقا کے پھول کھلانے اور آفاقیت کی خوشبو پھیلانے کا باعث بنی۔

اقبالؔ نے جہاں غزل میں الفاظ کو نئی معنویت کے ساتھ استعمال کر کے اسے آگے

---

[1] شمس الرحمٰن فاروقی "فنون" غزل نمبر ۶۹ء (ہندوستان میں غزل) ص ۳۲

[2] ڈاکٹر حنیف فوق "فنون" جدید غزل نمبر ۶۹ء (اُردو غزل کے نئے زاویے) ص ۸۳

[3] فتح محمد ملک "تعصبات" (غزل اور نئی غزل) ص ۱۴۸

[4] احمد شمیم "ادبِ لطیف" اپریل مئی ۵۵ء (غزل کا مستقبل)

بڑھنے کے کئی راستے دکھا دیئے وہیں غزل میں ایسے مضامین کو برتا جو اس سے پہلے یا تو سوچے ہی نہیں جا سکتے تھے اور اگر کبھی خیال میں آتے بھی تھے تو ان کا اظہار نظم میں کر دیا جاتا تھا۔ یوں اقبال نے حالی کے بعض نظریات سے اختلاف کے باوجود ان کی یہ خواہش ضرور پوری کر دی کہ غزل کو "ہر قسم کے جذبات کا آرگن" بنایا جائے اور اُردو غزل، جب نشیب فراز سے پُر بہت لمبا راستہ طے کرتی ہوئی، ولی، میر اور غالب کے زمانوں میں سونا بکھیرتی ہوئی ان کے پاس آئی تو اقبال نے اس میں زندگی کی نئی لہر دوڑا کر اُسے ایک ایسے بلند، پُرکشش اور روشن مقام پر پہنچا دیا جہاں سے وہ ہر آنے والے شاعر کی توجہ اپنی جانب کھینچتی رہی، صرف وہ لوگ اس نور سے محروم رہے جنہوں نے یا تو غزل کو صرف کلاسیکی روایت کی قید میں گرفتار رہنے دیا یا پھر اس روشنی کو اپنے اندر اترتا محسوس کر کے جان بوجھ کر اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے۔

اقبال کے ساتھ ساتھ ہم عصر اور کچھ بعد میں آنے والے شعرا نے نظم کی ترقی اور مقبولیت کے باوجود غزل کی طرف توجہ دی اور ثابت کیا کہ غزل ایک زندہ صنف ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ جدید غزل کی چھت کو مزید وسعت دینے کے لئے ان رنگ برنگے نئے ستونوں کی قطار کھڑی ہو گئی۔ ان میں شاد، حسرت، اصغر، آرزو، فانی، جگر، یگانہ، اختر شیرانی، حفیظ، جوش اور پھر فراق جیسے شعرا شامل ہیں۔ ان میں ہر ایک نے کلاسیکی اُردو غزل کے کسی نہ کسی روائتی انداز کو اپنایا اور پھر اس میں اپنے زمانے کی تازگی، توازن، تناسب اور اعتدال کو شامل کیا۔

شاد کے کلام میں ایک ایسا اضطراب ملتا ہے جو اپنے تیزی سے بدلتے زمانے کے حالات کی نمائندگی کرتا ہے۔ شاد حقیقت پسند ہیں اور ان کی شاعری میں مصوری کے ایسے نمونے ہیں جو اپنے دور کے جمالیاتی اضطراب کے عکاس ہیں۔

حسرت جدید غزل کا ایک خوش رنگ ستون ہیں۔ "اُردو غزل میں ان کا سب

سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ایک طرف انہوں نے غزل کو اس زہد پسندی Puritanism سے بچایا جسے حالی رواج دینے کی کوشش کر رہے تھے اور دوسری طرف انہوں نے غزل کو اس سطحی معاملہ بندی سے نجات دلائی جسے داغ اور امیر پورے ہندوستان میں مقبول بنا چکے تھے۔[1] "حسرت نے اپنی غزل میں سہلِ ممتنع کو انتہائی ترقی یافتہ صورت دی۔" حسرت نے مشقِ سخن اور چکی کی مشقت کو ایک ساتھ قبول کر کے نئے دور کے بڑھتے ہوئے تہذیبی، سیاسی اور سماجی تقاضوں کو پورا کیا۔[2] انہوں نے زمینی حقیقتوں سے عشق کیا "ان کا عاشق فرشتہ نہیں انسان ہے۔"[3] ان کا جذبۂ محبت بیمار نہیں صحت مند ہے اور اس کے ساتھ ساتھ انسانیت نے انہیں زندگی کی مشکلات کو وسعتِ نظر سے دیکھنے کا حوصلہ دیا۔ یوں حسرت کے ہاں زندگی کی مسرتیں جھلملاتی ہیں۔ وہ مسرت کو انسانی زندگی کی منزل سمجھتے ہیں۔

انہوں نے اپنے جذبۂ عشق کے ذریعے ایک تہذیب کی عکاسی کی ہے۔ وہ عشق میں پُرخلوص ہیں۔ اس لئے ان کی بے باکی بھی ایک معصوم شوخی کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے۔ "حسرت نے اپنے دور کی سماجی توانائیوں سے مدد لے کر عشقیہ تجربات میں جو گرمیاں بھر دی ہیں، ان سے غزل کے سلسلۂ اظہار میں بڑی وسعتیں آئی ہیں۔"[4] یہ درست ہے کہ "ان کی غزل میں فلسفیانہ اور مفکرانہ گہرائی نہیں لیکن بقول پروفیسر فراق اتنی نرم اور رچی ہوئی غزل گوئی اور اتنی حیرت انگیز پختگی کسی کے

۱۔ نظیر صدیقی۔ "فنون" جدید غزل نمبر ۶۹ء (جدید غزل پاکستان ہندوستان میں) ص ۱۵۴

۲۔ حنیف فوق۔ "فنون" جدید غزل نمبر ۶۹ء (اردو غزل کے نئے زاویے) ص ۸۴۔

۳۔ ڈاکٹر سید عبداللہ "اردو ادب ۱۸۵۷ء تا ۱۹۶۶ء" ص ۱۳۳

۴۔ ڈاکٹر حنیف فوق۔ "فنون" جدید غزل نمبر ۶۹ء (اردو غزل کے نئے زاویے) ص ۸۴۔

یہاں نہیں"[1] جہاں تک اندازِ بیان کا تعلق ہے۔ انہوں نے کلاسیکی اسالیب اور دورِ جدید کے مذاق کے خوشگوار امتزاج کے ذریعے غزل میں جان ڈالی۔ اُن کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ ان کے اشعار سہلِ ممتنع کی بہترین مثالیں ہیں۔ جن میں پیار محبت کی چھوٹی چھوٹی مگر خوبصورت باتوں کی تفصیل اکٹھی ہو گئی ہے۔ "جب حسرت کی شاعری کو ان کے زمانے کے پس منظر میں رکھ کر دیکھیں تو ان کی شاعری جدید غزل کا ایک حصّہ معلوم ہو گی"[2]۔

ادھر حسرت عشقیہ شاعری کر رہے تھے اور ادھر اصغر صوفیانہ شاعری کو نئی جہتوں سے آشنا کر رہے تھے۔ اصغر کی شاعری کا انداز میر درد کی متصوفانہ شاعری سے مماثلت نہیں رکھتا بلکہ اس سے مختلف ہے۔ میر درد نے جب اپنے زمانے کی حادثات سے پُر فضا میں رہ کر صوفیانہ شاعری کی تو اس میں زندگی کی بے ثباتی کو محسوس کراتی ہوئی دردناک لہریں اٹھتی ہیں جب کہ "اصغر کے یہاں اس کے بنیادی عناصر نشاط و مستی اور بے خودی کی کیفیات ہیں جو اپنے زمانے کی رجائیت کی پروردہ ہیں"[3]۔ یوں انہوں نے تصوّف میں تازگی اور خوشگواری پیدا کی۔ اصغر کی شاعری زندگی کے ٹھوس حقائق اور اس کی پیچیدگیوں کا اظہار نہیں کرتی لیکن اس کے باوجود وہ عمل کرنے کی ضرورت اور اہمیت کا احساس ضرور دلاتے ہیں۔

آرزو نے اُردو غزل کو خالص اُردو کا لبادہ اس طرح پہنایا کہ غزل کے مزاج کو کوئی ٹھیس نہ پہنچی۔ ان کی غزل کی سُریلی بانسری میں نغمۂ ہندی کی نرمی اور لطافت اور گفتار

---

[1] ڈاکٹر سید عبداللہ "اُردو ادب ۱۸۵۷ - ۱۹۶۶ء" ص ۱۳۳

[2] نظیر صدیقی "فنون" جدید غزل نمبر ۶۹ء جدید غزل پاکستان ہندوستان میں ص ۱۵۴

[3] خورشید احسن صدیقی "غزل کے جدید رجحانات" "افکار" ۶۰ء

اُردو کی شیرینی اور سحر سازی ملتی ہے[۱]۔"

کالی گھٹا میں کوندا لپکا، رو کے جو کوئل کوک گئی
جتنی گہری سانس کھنچی تھی اتنی لمبی ہوک گئی

یہ انداز انفرادیت، سادگی، دلکشی اور نیا پن لئے ہوئے ہے۔ بیشک اس میں کہیں کہیں بناوٹ کا احساس ضرور رہتا ہے اور یہ بھی درست ہے کہ ان کی غزل کا موضوع محدود ہے لیکن انہوں نے جو کچھ کہا اس کی قدر و قیمت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ عوام سے قریب کی زبان میں بھی اچھی شاعری کی جا سکتی ہے اور اس میں بھی انسان کے عام جذبات اور اس کے نفسیاتی موضوعات کو دلنشیں انداز میں بیان کیا جا سکتا ہے:

چپ ایک پہیلی ہے سوچو گے تو بوجھو گے
تم سے وہی کہنا ہے جو سب سے چھپانا ہے

دفعتاً ترک تعلق میں بھی رسوائی ہے
الجھے دامن کو چھڑاتے نہیں جھٹکا دے کر

"آرزو لکھنوی کے تجربات نے اُردو شاعری میں کوئی زبردست دھماکہ پیدا نہیں کیا لیکن ان کے تجربات بالکل رائیگاں بھی نہیں گئے[۲]۔" نیاز فتح پوری کے نزدیک "آرزو صاحب کی شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ باوجود اس امر کے کہ ان کی شاعری کا نشو و نما لکھنؤ کی فضا میں ہوا، وہ یہاں کی روایتی شاعری سے بالکل متاثر نہیں ہوئے

---

۱ ڈاکٹر حنیف فوق: "فنون" جدید غزل نمبر ۶۹ء (اُردو غزل کے نئے زاویے) ص ۔ ۹۱

۲ نظیر صدیقی: "فنون" جدید غزل نمبر ۶۹ء (جدید غزل پاکستان ہندوستان میں) ص ۱۶۱

اور انہوں نے تقلید و اتباع کو چھوڑ کر اپنا رنگ بالکل علیحدہ اختیار کیا اور جدید رحجانات کا ساتھ دینے میں اپنی زبان کو قائم رکھتے ہوئے ترقی کے بہت سے امکانات پیدا کر دیئے۔ اس خصوصیت میں ان کے دور کا کوئی شاعر ان کا ہمسر نہیں۔"[1]

اصغرؔ تو متصوفانہ رحجانات رکھنے کے ساتھ ساتھ رجائی طبیعت کے مالک تھے اس لئے وہ اس دنیا، اس زندگی سے پیار کرتے تھے جبکہ فانی نے اپنے حالات کو اپنے مزاج کا ساتھ دیتے نہ دیکھا تو زندگی ہی سے بغاوت کر دی۔ لیکن اس کے باوجود وہ خودکشی نہیں کرنا چاہتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ زندگی کو صرف اس لئے بُرا کہتے ہیں کہ انہیں اس کی موجودہ صورت پسند نہیں جو تیرِ نیم کش کی مانند ایک مسلسل خلش کا باعث ہے۔ ان کے زمانے میں سانس لینے والے لوگ اپنے منجمد، یخ کر دینے والے حالات کو پگھلا کر انہیں بدل دینے کی جدوجہد کر تو رہے تھے لیکن منزل تک جانے والے راستے کا ابھی تک تعین نہیں ہوا تھا۔ اس لئے ایک کشمکش، ایک غم، ایک گھٹن کی دھند سی چھائی ہوئی تھی، جس سے گھبرا کر مہذب اور شائستہ فانیؔ نے جو کھل کر رو بھی نہیں سکتے تھے، آنکھیں بند کر لیں اور اپنے ہی اندر جھانکنے کی کوشش کرنے لگے:

آنسو تھے سو خشک ہوئے، جی ہے کہ امڈا آتا ہے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے، کھلتی ہے نہ برستی ہے

"فانیؔ نے تقدیر کی بے رحم جبریت کا تصور پیش کیا۔ . . . یہ تصور اپنے دور کی سیاسی و سماجی صورتِ حال کے خلاف (جس میں ابھی تک جدوجہد کی کامرانی کے نقوش ابھرتے نہیں پائے تھے) احتجاج کی حیثیت تو رکھتا ہے۔ لیکن سماجی جدوجہد سے اپنے آپ کو الگ کر لینے کا نتیجہ بھی ہے۔"[2] فانیؔ نے زندگی سے راہِ فرار حاصل کر کے موت کی گود میں چھپ جانا

---

[1] نیاز فتح پوری "نگار" جنوری و فروری ۱۹۴۲ء (تلخیص و تبصرہ) ص ۶۸

[2] حنیف نوق۔ "فنون" جدید غزل نمبر ۱۹۶۹ء (اُردو غزل کے زاویے) ص ۸۶

چاہا، جو ان کے خیال میں ایک پرسکون مقام ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فانیؔ کو یقین تھا کہ موت کے بعد اُن کی ساری تمنائیں، ساری خواہشیں جو یہاں کسی نہ کسی وجہ سے پوری نہیں ہو سکتیں وہاں پوری کر دی جائیں گی۔ انہیں موت کی سیاہ رات میں روشن ستارے جھلملاتے ہوئے محسوس ہوئے تھے اور وہ اِس دنیا کی زندگی کی چکا چوند سے آنکھیں چُرا کر اُس دنیا کی زندگی کی مدھم، ٹھنڈی، پُرسکون روشنی کی جانب دیکھنے لگے۔ یوں انہوں نے ایک طرز کی زندگی کو اُکتاتے ہوئے دوسری طرز کی زندگی کا ہاتھ تھام لیا یعنی بہرحال انہوں نے اپنایا بھی تو زندگی ہی کو اپنایا۔ وہ سمجھتے تھے کہ موت کے بظاہر پُرسکون گھونگھٹ کے پیچھے ایک خوش رنگ زندگی سانس لے رہی ہے اور اسی دلہن کی خوبصورتی اور رعنائی کو اپنے تصورات میں سجا کر اس کے ملاپ کے انتظار میں انہوں نے اس جہاں کی ناپسندیدہ زندگی سے بھی ایک طویل عمر تک سانسیں سمیٹیں۔ اپنے بارے میں "نگار ۱۹۴۱ء" میں لکھتے ہیں: "میں ۱۳ ستمبر ۱۸۷۹ء کو دنیا میں لایا گیا۔ اب تک کہ دسمبر ۱۹۴۰ء ہے زندہ سمجھا جاتا ہوں"[1]۔ ویسے تو "موت کی آرزو اُردو شاعری میں کوئی نئی چیز نہیں لیکن انہوں نے جس شدت کے ساتھ موت کی آرزو کی اور جتنے حسین اور مؤثر پیرائے میں اس آرزو کو ظاہر کیا اس سے اُردو غزل میں ایک نیا رنگ پیدا ہو گیا"[2]۔ فانی کی زندگی میں جو فنا ہو جانے کی ایک تڑپ تھی اس نے انہیں سوزِ غم بخشا۔ ان کے فلسفۂ غم نے ان کی شاعری کو وسعت بھی دی اور گہرائی بھی۔ "فانیؔ کی شاعری نامرادی کی ماتم گسار ہے لیکن ان کے یہاں انسانی عظمت کا تصور اس کی تقدیر کی المناکی کے احساس کے باوجود برقرار رہا ہے اور یہ ان کی شاعری کا روشن پہلو ہے"[3]۔

۱۔ فانی بدایونی۔ "نگار" ۱۹۴۱ء۔ ص ۱۴۵

۲۔ نظیر صدیقی۔ "فنون" جدید غزل نمبر ۶۹ء (جدید غزل پاکستان ہندوستان میں) ص ۱۵۵

۳۔ ڈاکٹر حنیف فوق۔ "فنون" جدید غزل نمبر ۶۹ء (اُردو غزل کے نئے زاویے) ص ۸۶

یہ درست ہے کہ فانیؔ کا دائرۂ موضوع تنگ ہے اور کبھی کبھی اکتا دینے والی یکسانیت اور غنودگی کا احساس ہوتا ہے۔ "مگر یہ غنودگی ہے بڑی بلیغ اور پُر کیف"[۱]۔ فانیؔ نے صرف ایک حقیقت یعنی فنا کو ہی شاعری میں نہیں ڈھالا بلکہ ان کی شاعری میں ایک پُر خلوص محبت کی ڈھکی چھپی ناکامی بھی جھلکتی ہے۔ چونکہ فانیؔ ایک مہذب اور شائستہ مزاج رکھتے تھے اس لئے ان کے "یہاں شروع سے آخر تک عشق کی پاکیزگی اور حُسن کی لطافت کا احساس غالب ہے"[۲]۔

فانیؔ کو اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں غالبؔ نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ اور انہوں نے غالبؔ کی شاعری سے بے حد ذہانت اور خوبصورتی سے استفادہ کیا۔

یہ اثر بالواسطہ نہیں بلکہ بلاواسطہ ہے۔ وہ غالبؔ کی فکر سے بے حد متاثر ہوئے۔ اس وجہ سے "فانیؔ کی شاعری میں روایتی کلام سے الگ ایک ذہنی فکری رجحان ملتا ہے"[۳]۔ ان کے یہاں غالبؔ کی شوخی اور خوش مزاجی تو نہیں لیکن کئی بے حد اچھے طنزیہ اشعار بھی کہہ جاتے ہیں ؎

بجلیوں سے غربت میں کچھ بھرم تو باقی ہے
جل گیا مکاں، یعنی تھا کوئی مکاں اپنا

فانیؔ کا اندازِ بیان اپنے ہم عصر شاعروں سے بالکل مختلف ہے۔ ان کے "یہاں فلسفہ طرازی، غم، تغزل، زبان سبھی کا امتزاج ہوتا ہے۔۔۔۔ فانیؔ کے یہاں غم ہے تو غم کا عرفان بھی ہے۔۔۔۔ وہ فلسفی نہیں لیکن فلسفیانہ استدلال یا طرزِ بیان رکھتے ہیں۔ وہ

۱؎ پروفیسر مجنوں گورکھپوری۔ "نگار" ۱۹۴۲ء ص ۴۶

۲؎ ابواللیث صدیقی۔ "غزل اور متغزلین"، ص ۲۲۲

۳؎ سجاد باقر رضوی۔ "تہذیب و تخلیق (فانیؔ بدایونی) ص ۱۷۵

واردات انسانی کے بہت کامیاب مصوّر ہیں۔۔۔۔ قدیم رنگ برتنے والوں میں فانی کا لہجہ سب سے زیادہ آفاقی ہے"[1] انہوں نے نہ صرف پرانے اور فرسودہ خیالات میں تازگی پیدا کی بلکہ اپنی شاعری کا معیار بھی بلند کرنے کی کوشش کی۔" فانی کا اسلوب اُردو غزل کے بہترین اسالیب میں سے ہے۔ وہ اپنے پڑھنے والوں کو اپنے اندازِ بیان سے صرف متاثر ہی نہیں کرتے، چونکا بھی دیتے ہیں۔۔۔۔۔ ان کے لہجے میں وہ دھیما پن اور بیان میں وہ ٹھہراؤ ہے جو حد درجہ شائستہ اور مہذّب طبیعت کا پتہ دیتا ہے"[2]

یگانہ اپنے تمام ہم عصروں میں سب سے زیادہ طاقت ور شخصیت کا تصوّر لے کر سامنے آئے جو مصائب کو سامنے دیکھ کر کڑھتی بھی ہے لیکن ان کا مقابلہ کرنا بھی جانتی ہے۔ یوں وہ آج کل کے بھی یعنی ہمارے اس دور کے انسان کے اتنے قریب چلے آئے جتنے شاید اقبال بھی نہ آسکے۔ ان کی شاعری پڑھیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یگانہ کے انسان کے نفسیاتی آئینے میں آج کل کا انسان منعکس ہو رہا ہے ؎

خدا ہی جانے یگانہ میں کون ہوں کیا ہوں
خود اپنی ذات پہ شک دل میں آئے ہیں کیا کیا

"یگانہ کی غزل کا مرد بیسویں صدی کی اتنی سچّی نفسیات رکھتا ہے کہ ہم سب کے وجود کی تاریک تہوں میں اس کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا"[3] اور یہ درست ہے کہ "یگانہ ان شاعروں میں سے ہیں جن کا لہجہ آج کے دور سے، جو بڑی حد تک کھردری حقیقتوں کا دور ہے، قریب کا تعلق رکھتا ہے"[4] یگانہ کی ایک بہت اچھی اور خوبصورت غزل ہے جس کا مطلع ہے:

---

[1] آل احمد سرور۔ "نگار" ۱۹۴۲ء (تبصرہ) ص ۳۵

[2] نظیر صدیقی۔ "فنون" جدید غزل نمبر ۶۹ء ص ۱۵۶

[3] سلیم احمد۔ "فنون" جدید غزل نمبر ۶۹ء (جدید غزل) ص ۴۰

[4] ڈاکٹر حنیف فوق۔ "فنون" جدید غزل نمبر ۶۹ء ص ۔ ۸۹

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہؔ مگر بنا نہ گیا

اس میں ایک ایسے انسان کے احساسات و کیفیات کا ذکر ہے جس نے اس وسیع تر کائنات میں اپنے وجود کی حیثیت کو شناخت کر لیا:

ہنسی میں وعدۂ فردا کو ٹالنے والو
لو دیکھ لو، وہی کل، آج بن کے آ نہ گیا

گناہِ زندہ دلی کہیئے یا دل آزاری
کسی پہ ہنس لئے اتنا کہ پھر ہنسا نہ گیا

کروں تو کس سے کروں دردِ نارسا کا گلہ
کہ مجھ کو لے کے دلِ دوست میں سما نہ گیا

پکارتا رہا کس کس کو ڈوبنے والا
خدا تھے اتنے مگر کوئی آڑے آ نہ گیا

یگانہؔ کو غالبؔ کی طرح اپنے زمانے نے نہ پہچانا لیکن غالبؔ کو ہزار ناکامیوں کے باوجود اتنا یقین ضرور ہو گیا تھا کہ اب نہیں تو آنے والا زمانہ ان کی قدر کرے گا۔ اس اعتماد نے انہیں مکمل طور پر مایوس نہیں ہونے دیا۔ جبکہ یگانہؔ کو اپنے عصر نے قبول کرنے سے انکار کیا تو وہ بپھر گئے۔ اسے اپنی شکست سمجھا اور تڑپ اٹھے۔ پھر اپنی ہی انفرادیت کی قوت لے کر جب وہ شدت سے لپکے تو ان کا مٹتی ہوئی تہذیبی اقدار کے زمانے سے شدید تصادم ہو گیا اور اس سے جو دھواں اٹھا وہ فرد اور معاشرے کے ٹوٹتے رشتے کا علَم بن گیا جو پہلے اس طرح اُردو شاعری میں کبھی نہیں بلند ہوا تھا۔ وہ "پہلے شاعر ہیں جو ہم کو زندگی کا جبراتی رُخ دکھاتے ہیں اور ہمارے اندر سعی و پیکار کا ولولہ پیدا کرتے ہیں۔"[1]

---

[1] مجنوں گورکھپوری۔ "نگار" ۱۹۴۲ء (غزل اور عصرِ جدید) ص ۔ ۵۰

مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائے گا
مجھے سر مار کر تیشے سے مر جانا نہیں آتا

عجب کیا ہے ہم ایسے گرم رفتاروں کی ٹھوکر سے
زمانے کے بلند و پست کا ہموار ہو جانا

نہ خداؤں کا نہ خدا کا ڈر، اسے عیب جانیے یا ہُنر
وہی بات آئی زبان پر جو نظر پہ چڑھ کے کھری رہی

یگانہ کی شاعری غالب کے بعد پہلی بار قوت سے بھر پور انسانی زندگی کی نئی تصویر بن گئی۔ انہوں نے نئے خیالات کی تازہ خوشبو پھیلائی اور خوبصورت جواں لہجہ رکھا۔

یگانہ نے غالب سے آنکھیں چُرانا چاہی تھیں۔ انہوں نے "غالب شکن" ہونے کا دعویٰ شاید اس لیئے کیا ہوگا کہ انہیں معلوم تھا کہ غالب بہت بڑا شاعر ہے اور وہ اس سوچ کو جھٹلاتے ہوئے بھی جانتے تھے کہ وہ خود جتنے بھی اونچے ہوں غالب کو نیچا نہیں دکھا سکتے۔ تب ہی تو سورج جیسے غالب کی کرنوں سے چھپ کر سائے سائے چلنے کی کوشش کے باوجود ان کرنوں کی تپش سے نہ بچ سکے۔ اس لیئے کہ اس دھوپ کی ان کے مزاج کو ضرورت تھی:

موت مانگی تھی خدائی تو نہیں مانگی تھی
لے دعا کر چکے، اب ترکِ دعا کرتے ہیں

تڑپ کے آبلہ پا اٹھ کھڑے ہوئے آخر
تلاشِ یار میں جب کوئی کارواں نکلا

آ رہی ہے یہ صدا کان میں ویرانوں سے
کل کی ہے بات کہ آباد تھے دیوانوں سے

پڑے ہو کون سے گوشے میں تنہا یگانہ کیوں! خدائی ہو چکی! بس؟

میں پیمبر نہیں، یگانہ سہی اس سے کیا کسر شان میں آئی

اپنے زمانے اور غالب کے خلاف ردِ عمل کی بھی ایک وجہ تھی۔ زمانے نے نہ تو انہیں دنیاوی سکون دیا نہ ذہنی۔ انہوں نے ایک امیر مگر پریشان حال گھرانے میں پرورش پائی۔ ایسے گھرانوں کی سب سے بڑی دولت خودداری ہوتی ہے اور جب خودداری کو ٹھیس لگے تو وہ خود پرستی کی حدود تک بکھر جاتی ہے۔ یگانہ حساس طبیعت کے مالک تھے۔ ایسے لوگ جب مایوس ہوں تو یا تو کم ہمتی میں مبتلا ہو کر اپنے آپ کو اذیت دینے لگتے ہیں یا پھر بچے کھچے حوصلے کو سمیٹ کر مقابلے کے لئے ڈٹ جاتے ہیں اور انتقام لینے کی اور ہر شئے کو مسخر کرنے کی سوچنے لگتے ہیں۔ یگانہ مایوس ہو کر جب اپنے آپ سے الجھ پڑے تو انہیں محسوس ہونے لگا کہ ان کی اپنی انفرادیت بہت طاقتور ہے لیکن کیا کیا جائے کہ اس طاقت کو ماننے والا کم از کم اس وقت سوائے یگانہ کے کوئی اور نہ تھا۔" طبیعت کی جھنجلاہٹ، ضرورت سے زیادہ سنجیدگی اور خلوص کا نتیجہ یہ تھا کہ یگانہ کی طبیعت میں مزاح کا کوئی عنصر باقی نہ رہ گیا اور وہ اپنی "انا" کی حفاظت میں جو ہر گھڑی گرد و پیش سے مجروح ہوتی رہتی تھی، انانیت پسند ہو گئے"[1] ان کی نظر میں نہ صرف اپنے ماحول کی پستی نمایاں ہوئی بلکہ بڑی اور اچھی

---

[1] سجاد باقر رضوی۔ "تہذیب و تخلیق"، ص۔ ۱۸۷

چیزیں بھی ہیچ دکھائی دینے لگیں جن میں غالبؔ کا فن اور یگانہؔ کے اپنے ہی محبوب کا حسن بھی شامل ہے"۔ اپنی محبوبہ سے بے نیازی کی ایک روایت یگانہؔ ہی سے چلی جو آج تک قائم ہے[1]"۔ شدت کے ردِ عمل اور بغاوت نے " ان کے کلام میں توازن اور اعتدال کو بڑا صدمہ پہنچایا۔۔۔۔۔اس معاملہ میں وہ حد سے بڑھ گئے[2]"۔ اسی وجہ سے ان کے ہاں نرمی اور حلاوت کی کمی ہوئی۔ لیکن اس سب کے باوجود اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ " اسی کش مکش اور ردّ و بدل کی منزلوں سے گزر کر یگانہؔ اُردو غزل کو نئے تیور اور جدید آہنگِ اظہار دینے میں بڑی حد تک کامیاب ہوتے ہیں[3]"۔ ترقی پسندی کے بھی واضح رجحانات ان کی غزلوں میں ہیں اور ان کی قدر و قیمت کا خیال کئے بغیر ہم یگانہؔ کو صحیح طور پر کبھی نہیں پہچان سکتے، نہ ہی ان کی غزلوں کی وسعت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ باقی رہیں ان کی شاعری کی کچھ خامیاں تو ہمیں وہ برداشت کرنا چاہئیں، اس لئے کہ ایک فن کار نے اپنے ایک مضمون میں کہا تھا " زمانے کے جس دور سے ہم اس وقت گزر رہے ہیں اگر آپ اس سے ناواقف ہیں تو میرے افسانے پڑھیے، ۔۔۔۔۔ اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب ہے کہ یہ زمانہ ناقابلِ برداشت ہے۔ مجھ میں جو برائیاں ہیں وہ اس عہد کی برائیاں ہیں[4]"۔ اور یہ ماننے والی بات ہے کہ یگانہؔ جو کچھ ہیں اس کے بنانے میں ان کے زمانے کا بہت ہاتھ ہے۔

۱؎ سجاد باقر رضوی۔ " تہذیب و تخلیق"، ص ۱۸۷

۲؎ ابواللیث صدیقی۔ " غزل اور متغزلین"، ص ۴۴۲

۳؎ حنیف فوق۔ " فنون"، جدید غزل نمبر ۶۹ء۔ ص ۸۸

۴؎ سعادت حسن منٹو۔ " ادبِ لطیف"، سالنامہ ۴۴ء (ادب جدید)

جگرؔ مراد آبادی کی شاعری مستی میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اس جھومتی ہوئی شاعری میں بھی وقت کے "ساتھ ساتھ ان کا سماجی اور سیاسی شعور بیدار ہوتا چلا گیا۔"[1] جگرؔ کے اشعار کی خوبی ان کی سادگی اور برجستگی ہے۔ جگرؔ کو تہذیبی روایات سے آشنائی تھی۔ ان کی اہمیت اس لئے بھی ہے کہ انہوں نے جو کچھ لکھا چاہے خمریات کے بارے میں چاہے عشق کے بارے میں، سب ان کے اپنے ہی تجربات تھے۔ جگرؔ کو درد نے دھونے سے دلچسپی نہیں تھی۔ بس سرشاری و مستی کو اپناتے تھے۔ جدیدیت کو ذہنی طور پر قبول کر لینے کے باوجود ان کے کلام میں جدید رنگ کچھ زیادہ چمک نہیں پایا، دھندلا ہی رہ گیا۔ اور جب ذرا چمکنے لگا تو وہ ان کا بالکل آخری دور تھا۔

اخترؔ شیرانی نظم کے شاعر ہیں۔ اُردو غزل میں انہیں کوئی بہت اونچا مقام حاصل نہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ ان کے ہاں فکر کی گہرائی بھی نہیں لیکن ان کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔" اخترؔ نے اُردو کی رومانی شاعری کو ایک نیا لہجہ دیا، ان کے یہاں واضح طور پر "محبوب عورت" کا تصور متعین ہوا[2]" اور اس چیز نے جدید غزل میں حسرتؔ موہانی سے ایک قدم آگے بڑھ کر ایک اور حقیقت سے سارے پردے ہٹا دیئے۔" رومانیت اور موسیقیت ان کی شاعری کی نمایاں خصوصیتیں ہیں۔۔۔۔ ان کے ہاں ایک سچے قسم کا گداز، ایک بلند قسم کی المناکی ہوتی ہے۔۔۔۔ اخترؔ کے اسلوب اور ان کی زبان میں جدّت اور بے ساختہ پن کے باوجود پختگی ہوتی ہے جو ان کے اشعار کی دلکشی بڑھا دیتی ہے[3]۔"

۱؎ نظیر صدیقی۔ "فنون" جدید غزل نمبر ۶۹ء۔ ص ۱۵۷

۲؎ ڈاکٹر سید عبد اللہ۔ "اُردو ادب ۱۸۵۷ء تا ۱۹۶۶ء"۔ ص ۱۴۵

۳؎ مجنوں گورکھپوری۔ "نگار" ۴۲ء۔ ص ۴۹۔

حفیظؔ نے اُردو غزل کو غنائیت کے سُروں سے مالا مال کیا۔ حفیظؔ کے یہاں نئے مضمون ہیں نہ نئے اسالیب لیکن ایک نئی سادگی اور دلکشی ضرور ہے۔ الفاظ بلکہ پورے پورے فقروں کی تکرار سے کسی نے اتنا لطف پیدا نہ کیا ہوگا جتنا حفیظؔ نے کیا:[۱]

شوقِ وصال ہے یہاں، لب پہ سوال ہے یہاں
کس کی مجال ہے یہاں، ہم سے نظر ملا سکے

آئینہ دیکھیئے، مری صورت نہ دیکھیئے
میں آئینہ نہیں مجھے حیراں نہ کیجئے

غم موجود ہے، آنسو بھی ہیں، کھا تو رہا ہوں، پی تو رہا ہوں
جینا اور کسے کہتے ہیں، اچھا خاصا جی تو رہا ہوں

جوشؔ نظم گو شاعر ہیں اور اپنی کہی ہوئی غزلوں کو بھی نظمیں ہی کہتے ہیں اور یہ ہے بھی درست کیونکہ "جوشؔ کی زبان اور اُن کا اندازِ بیان، تغزل کی لطافت کے بالکل منافی ہے"۔[۲] جوشؔ نے اُردو غزل میں جدید رنگ بھرنے کی اس طرح کوشش کی کہ اسے نئی زبان اور نیا اندازِ بیان دیا۔ انہوں نے اُردو غزل کو خیالات کی شاعری بنانے کی سعی بھی کی۔ لیکن ان کی اپنی شاعری ایسا کرنے میں کامیاب نہ ہوسکی۔ پروفیسر کلیم الدین احمد بڑے سخت لہجے میں کہتے ہیں کہ "جوشؔ کے الفاظ سے قارئین ایسے مرعوب ہوجاتے ہیں کہ وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان اشعار میں پُرجوش جذبات یا بلند، گہرے خیالات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ اگر الفاظ سے قطع نظر کر کے

۱؎ آل احمد سرور۔ "نگار" ۴۲ء (تبصرہ) ص۔ ۳۴

۲؎ نیاز فتح پوری۔ "نگار" ۴۲ء (تلخیص و تبصرہ) ص۔ ۷۵

دیکھا جائے تو مضمون نہایت معمولی نظر آئے گا۔۔۔۔ جو دل پر گزرتی ہے اس کی وہ عکاسی نہیں کرتے“۔[1]

یوں اقبالؔ نے جدید غزل کے لئے جو راستہ بنایا، شادؔ، حسرتؔ، اصغرؔ، آرزوؔ، فانی، جگرؔ، یگانہؔ، اختر شیرانیؔ، حفیظؔ اور جوشؔ وغیرہ اس راستے سے آملنے والی مختلف پگڈنڈیاں ہیں۔ ان سب کا سنگم فراقؔ کی شاعری پہ ہوتا ہے۔ فراقؔ سب کے تجربات سے استفادہ کرتے ہوئے جدید غزل کی فصل کے لئے ایک بے حد وسیع کھیت تیار کر دیتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انہوں نے سب کچھ دوسروں سے لیا ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہے، بلکہ میرؔ کی طرف مراجعت کے باوجود انہوں نے اُردو غزل کو اپنے ذاتی تجربات کے ذریعے دیا بھی بہت کچھ ہے۔ ”فطرت کے جلوؤں، حُسن کی خوابناک اور نشاط آور کیفیتوں، جذبۂ عشق کی اُداسیوں، نفسیاتی تہہ داریوں، زندگی کی پیچیدگیوں، تہذیبی نرمیوں، انسانیت کے درد آمیز نغموں، جمالیاتی صورتوں، اپنے عصر کی انقلابی صداقتوں اور جذبۂ لطیف کی پرچھائیوں کو جس عالمانہ بے خودی کے ساتھ فراقؔ پیش کر سکتے ہیں وہ ان ہی کا حصّہ ہے۔ جدید غزل کے ارتقاء میں ان کے شاعرانہ آہنگ اور لہجے کے تاثرات کا بڑا ہاتھ ہے“۔[2] یہ فراقؔ کی خوبی ہی ہوئی کہ انہوں نے ماضی کا ہاتھ تھامنے کے بعد مستقبل کی طرف اپنا دوسرا ہاتھ بڑھا دیا۔ اب اگر بقول فراقؔ ہی کے ان کے دل میں امیر مینائی، میر تقی میر، درد، غالب کی آوازیں اتر تی گئیں اور وہ حسرت، اصغر، یگانہ، اقبال کے کلام سے بھی فیض یاب ہوتے رہے اور فارسی شعراء سے بھی اور ساتھ ہی ساتھ انگریزی ادب کو بھی اپنے اندر یوں تحلیل کرتے رہے کہ اُس کی آواز ان کی اپنی آوازیں

---

[1] کلیم الدین احمد ”نگار“ ۴۲ء (بزمِ نگار) ص۔ ۱۱

[2] ڈاکٹر عنیف فوق ”فنون“ جدید غزل نمبر ۶۹ء ص۔ ۹۳

ڈھلتی جائے[1] تو یہ تو اچھی بات ہوئی۔ اس سے کسی بڑے شاعر کی انفرادیت مجروح نہیں ہوتی بلکہ اور نکھرتی ہے۔ اسی وجہ سے تو فراق کی غزل میں روایاتِ غزل کے ساتھ ساتھ زندگی سے بھرپور نئی کیفیات اور نیا آہنگ بھی ہے۔ یوں " اپنی غزلوں میں فراق نے جدید ذہن کے فکر و احساس کو جمالیاتی آہنگ کے ساتھ پیش کیا۔"[2]

نہ کوئی وعدہ، نہ کوئی یقیں، نہ کوئی اُمید
مگر ہمیں تو ترا انتظار کرنا تھا

اگر بدل نہ دیا آدمی نے دنیا کو
تو جان لو کہ یہاں آدمی کی خیر نہیں

جہاں میں ترکِ تعلق نہیں ہے ترکِ رسوم
وہ سامنے ہیں تو ہم بھی کہاں تک آنکھ چرائیں
کچھ آدمی کو ہیں مجبوریاں بھی دنیا میں
ارے وہ دردِ محبت سہی، تو کیا مر جائیں؟

برسوں ترے غم میں رو چکے ہم ۔۔۔ اب اور بھی کام دیکھیں بھالیں

فراق نے عشق کیا ہے اور عشق کی نفسیات کی گہرائیوں کو واضح کرتے ہوئے ایسی شاعری کی ہے جو اُردو کی بہترین عشقیہ شاعری کا ایک نمایاں حصّہ ہے۔ انہوں نے زندگی اور

---

[1] فراق گورکھپوری۔ "نگار"، غزل گو شعرا نمبر ۱۹۴۱ء، ص ۔ ۱۵۴

[2] حنیف فوق۔ "فنون"، جدید غزل نمبر ۶۹ء" ص ۔ ۹۲

عشق کو ایک کر دیا۔ فراقؔ کے خالص تغزل میں غزل گو شعرا کی رسمی تلخی نہیں، نہ گردشِ فلک کا شکوہ، نہ جورِ آسماں کی شکایت ہے۔ بلکہ زندگی انقلاب کی جس دہکتی ہوئی آگ، جس کشمکش اور جدوجہد سے گزر رہی ہے وہ ان غزلوں میں جھلکتا اور قریب نظر آتا ہے[۱]:

ہزار شکر کہ مایوس کر دیا تم نے
یہ اور بات کہ تم سے بڑی امیدیں تھیں

یہ ذلتِ عشق تیرے ہاتھوں اے دوست تجھے کہاں چھپالیں

فراقؔ نے یگانہ کی طرح زندگی کو بے نقاب کیا لیکن دونوں کی سوچ میں بے حد فرق ہے۔ یگانہ نے زندگی کو طنز بھری نگاہوں سے دیکھا اور اس پر چوٹیں بھی کیں جبکہ فراقؔ نے زندگی کو اس کے دکھوں سکھوں اور خوبیوں خامیوں سمیت قبول کیا، بلکہ مزید نکھارنے کی کوشش بھی کی۔ یوں فراقؔ کے ہاں فانیؔ اور یگانہ سے کہیں زیادہ وسعت اور تنوع پیدا ہو گیا۔ فراقؔ کو انسانیت سے پیار ہے اور اسی لئے وہ آفاقی قدروں کے قائل ہیں۔ ان کے ہاں زندگی کا جلال و جمال نئی اقدار کو ساتھ لئے صدیوں تک پھیلنے کے دیئے آگے بڑھتا ہے اور یہیں سے ہماری شاعری حقیقتوں سے ہمکنار ہوتی ہے۔ فراقؔ کے ہاں منتخب کلام کا توازن اور تناسب نہیں لیکن یہ کمی ان کی شاعری کے مجموعی حُسن کو ختم نہیں کر دیتی۔ فراقؔ کے اسلوب میں جو پختگی اور گھلاوٹ ہے وہ ان کا اپنا خاصہ ہے اور پھر ان کی شاعری کا آہنگ Rhythm جو ان کے اشعار کو بلاغت دیتا ہے۔ فراقؔ کے ہاں فکر و احساس کے امتزاج نے ایک نئی فضا قائم کی ہے۔ "جو معنوی تہیں ہم کو فراقؔ کی غزلوں میں ملتی ہیں وہ عموماً دوسرے اور شاعروں کے ہاں نہیں ملتیں

۱؎ ابو اللیث صدیقی۔ "غزل اور متغزلین" ص ۲۵۰

کبھی کبھی تو ان کے دو مصرعوں میں اتنی تہہ اور گہرائیاں ہوتی ہیں کہ معنی یاب سے معنی یاب طبیعت اندیشہ ناک ہونے لگتی ہے کہ تھاہ کہیں ملے گی بھی یا نہیں"[۱]

ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہ گزر پھر بھی

یہ موڑ وہ ہے کہ پرچھائیں بھی دیں گی نہ ساتھ
مسافروں سے کہو اس کی رہ گزر آئی
کہاں ہر ایک سے بارِ نشاط اٹھتا ہے
کہ یہ بلا بھی ترے عاشقوں کے سر آئی

قیامِ پاکستان سے قبل ہی اردو غزل میں ایک ایسے رجحان کی بنیاد رکھ دی گئی تھی جس پہ عالی شان عمارت پاکستان بننے کے بعد تعمیر ہوئی۔ اس رجحان کے زیرِ اثر لکھی جانے والی غزل نے جہاں اقبال کے بعد یہ احساس دلایا کہ غزل کوئی محدود یا نری داخلیت زدہ صنفِ سخن نہیں بلکہ وہ تو ایک کائنات ہے جس میں ہر رنگ اور ہر شکل کی اشیا سمائی ہوئی ہیں۔ وہیں اس غزل نے پاکستان کے ان ایام میں بھی افکار و خیالات اور جذبات و احساسات کی سچائیوں اور انسانیت کے حقوق کے اظہار کی ذمّہ داری سنبھالی جب:

ایسے غنچے بھی تو گُل چیں کی قبا میں ہیں اسیر
بات کرنے کو جو اپنا ہی دہن مانگتے ہیں (ندیم)

یہ صحت مند رویہ ترقی پسند تحریک کا دیا ہوا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں جب اس تحریک کا آغاز ہوا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ادب کو زندگی کی ترجمانی بھی اسی روز نصیب ہوئی حقیقت

---

[۱] مجنوں گورکھپوری۔ "نگار" ۴۲ء ص۔ ۵۰-۵۱

یہ ہے کہ یہ عمل تو ہمیشہ سے جاری تھا۔ اس کو واضح طور پر بیان کرنے اور اس کا کھل کر اظہار کرنے والے اقبال تھے۔ اقبال اتنی قوت رکھتے تھے کہ جہاں ان کی روشنی نے بہتوں کو راستے سجھائے وہیں کئی لوگوں کی آنکھیں بھی چندھیا دیں۔ یوں ان کا اثر اور ان کا ردِ عمل دونوں برابر چلتے رہے اور آخر ترقی پسند تحریک میں ایک نقطے پر اکٹھے ہو گئے۔ کسی بھی تحریک کے لئے ضروری ہے کہ عظیم شخصیتیں اسے سہارا دیں اور عام مقبولیت اسے آگے چلائے۔ اس تحریک کو عظیم شخصیت تو پریم چند کی ملی (جبکہ اقبال موجود تھے مگر وہ بجائے خود ایک تحریک تھے) ان شعرا و ادبا نے اس تحریک کا بھرپور ساتھ دیا جن کی شاعری کی ابتدا ۳۶ء سے قبل ہو چکی تھی اور جو پڑھنے والوں سے متعارف ہو چکے تھے۔

"اس تحریک کے دو دَور ہیں۔ ایک آزادی سے پہلے کا اور دوسرا حصولِ آزادی کے بعد کا۔ پہلے دَور کا مقصد عوام کو غلامی کی لعنت کا احساس دلا کر ان میں سیاسی شعور بیدار کرنا تھا تاکہ وہ حصولِ آزادی کی اجتماعی جد و جہد کا حصّہ بن سکیں اور دوسرے دور کا نصب العین حاصل کردہ آزادی میں غیر ملکی شاطروں کی چال کو اُجاگر کرنا، آزادی کو فی نفسہٖ منزل قرار دینے والوں کی تکذیب اور پیدا شدہ سیاسی شعور سے گرد و پیش کے مسائل کا ادبی تجزیہ تھا۔"[1]

"ترقی پسند تحریک زندگی اور عمل کی تحریک تھی، اس سے اُردو ادب خاصا متاثر ہوا اور اس کے ادبی سرمائے میں اضافہ بھی ہوا۔ اس تحریک سے فکر و نظر میں بہت سی اہم اور حیات بخش تبدیلیاں بھی پیدا ہوئیں۔"[2]

باقی سب اصنافِ ادب کی طرح غزل بھی اس دھوپ کی زندگی بخش تپش سے

۱۔ امین راحت چغتائی "فنون" جدید غزل نمبر ۶۹ء (اب دبی حرفِ جنوں ۔۔۔) ص۔ ۲۳۲

۲۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، "خیابان" خاص نمبر۔ دسمبر ۵۷ء (پاکستانی ادب کے دس سال) ص۔ ۲۰۰

محروم نہ رہی۔

اسی تحریک کے ردِ عمل میں ۷۰ء سے پہلے ہی میراجی سکول اُبھرا جس کا غالب رجحان علامت پسندی کا تھا لیکن علامتوں میں ترقی پسندوں کی طرح کسی سیاسی، سماجی یا معاشی مسئلے کی وضاحت مقصود نہ تھی بلکہ ذات اور صرف اپنی ذات کا اظہار تھا۔ ان لوگوں نے نظم نگاری میں نئی نئی ہیئتوں کی تلاش بھی کی۔" ان دونوں مکتبہ ہائے فکر نے اپنے اپنے طور پر اُردو شاعری میں نئی راہیں تراشیں، نئے اسالیب پیدا کئے، اور غزل کے مقابلے میں نظمیہ شاعری کو پورے عروج پر پہنچا دیا۔ ان گروہوں کی آپس میں کشمکش بھی اُردو ادب کے حق میں نیک شگون ثابت ہوئی۔ ان کی حریفانہ کوششوں نے ترقی کی منازل طے کرنے میں مدد دی۔"[۱] ہمیں یہاں ۷۰ء سے پہلے کی ترقی پسند غزل پر ایک نظر ڈالنا ہے۔ ترقی پسند غزل گو شعراء میں سے اہم یہ ہیں۔ فراقؔ کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ پھر فیضؔ احمد فیضؔ، احمد ندیمؔ قاسمی ہیں، ظہیرؔ کاشمیری ہیں۔ یہ لوگ ۷۰ء سے قبل بھی اچھی غزل کہتے رہے۔

سرِ خسرو سے نازِ کج کلاہی چھن بھی جاتا ہے
کلاہِ خسروی سے بوئے سلطانی نہیں جاتی (فیضؔ)

پاپوش کی کیا فکر ہے، دستار سنبھالو
پایاب ہے جو موج، گزر جائے گی سر سے (فیضؔ)

انسان اب کچھ نکھرے تو نکھرے   سونے پڑے ہیں شاہوں کے دربار (ندیمؔ)

۱؎ فارغ بخاری: "نئی قدریں"، فکرِ جدید نمبر ۹۶ (آج کا شعری ادب)

اُجڑ رہے ہیں گھرانے، بدل رہے ہیں زمانے
لپک رہے ہیں دِوانے، اتار ہو کہ چڑھاؤ (ندیم)

ہر گام بجلیوں سے الجھنا پڑا ظہیر
ہم وہ اسیرِ دائرہ اختیار تھے (ظہیر)

بن جائیں گے ہم صبحِ درخشاں کے پیامی
ہم قافلۂ شب کی قیادت نہ کریں گے (ظہیر)

وہ زمانہ ان فن کاروں کی شاعری کی ابتدا کا زمانہ تھا۔ ان کا اصل مقام آزادی کے بعد کی غزل سے ہی متعین ہو سکتا ہے۔ ترقی پسند غزل کو توانائی قیامِ پاکستان کے بعد سے ہی حاصل ہونا شروع ہوئی۔ یہ تھی اُردو غزل کے اس سفر کی روداد جو ابتدا سے قیامِ پاکستان تک پیش آئی۔ اس راہ میں آنے والے کئی سنگِ میل آج بھی جگمگا رہے ہیں اور اب اگلے باب میں انہی کی روشنی میں ہمیں ۴۷ء کے بعد کی جدید غزل کی تازگی اور انفرادیت تک پہنچنا ہے، اور یہ معلوم کرنا ہے کہ اتنے قد آور غزل گو شعرا کی قطار میں ناصر کاظمی نے اپنی انفرادیت کو کیسے تسلیم کرا لیا۔

تیسرا باب

غزل کی حیاتِ نو ــ اور ناصر کاظمی

ہم نے آباد کیا ملکِ سخن
کیسا سنسان سماں تھا پہلے (ناصرؔ)

یہ برِّ اعظم پاک و ہند جو اب پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش میں منقسم ہے آج سے ۳۴ سال پہلے ایک ہی ملک تھا۔۔۔ہندوستان۔۔۔ وہ ملک ہندوستان جو مسلمانوں کی آمد سے وسعتِ قلب و نظر کا حامل ہو گیا۔ دینِ اسلام میں ویسا تعصب نہیں جو غیر مذہب پر ظلم و زیادتی کو ضروری سمجھے۔ اسی وجہ سے یہاں کے لوگوں کو جب مسلمانوں نے دھتکارنے کی بجائے ان سے قرب حاصل کیا تو یہاں کے لوگ بھی متاثر ہوئے اور یوں ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے ایک سنگم بن گیا۔ یہ سنگم تھا اُردو زبان۔۔۔ اُردو زبان نہ صرف ہندوستان کے سیاسی حالات بلکہ سماجی و تہذیبی حالات کی بھی پیداوار ہے۔

یوں سمجھنا چاہیئے کہ اگر اُردو زبان کے ماخذ کا علم ہو تو ہمیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہذیبی و سماجی تعلقات کا بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں کی آمد سے قبل یہاں سنسکرت اور دوسری قدیم زبانیں رائج تھیں مسلمان اپنے ساتھ عربی، فارسی لائے اور ان سب کے میل جول سے اُردو زبان بنی۔

یہ تعلق خوبصورت شکل میں مغلوں کے دورِ حکومت میں پروان چڑھا۔ ہندو اور

مسلمان ایک دوسرے سے اثرات بھی لیتے اور یہ بھی خیال رکھتے کہ ان کی کسی بات سے دوسرے عقیدے کے لوگوں کو دکھ یا ناگواری نہ ہو۔ یوں تو یہ تو میں واضح طور پر دو الگ الگ تو میں تھیں لیکن میل جول سے کچھ مشترکہ خصوصیات بھی پیدا ہوئیں۔ اُردو زبان کے تار و پود میں یہ مشترکہ خصوصیات نمایاں ہیں۔ غزل اُردو شاعری کی نمائندہ صنف ہے۔ اُردو غزل ہندوؤں نے بھی کہی اور مسلمانوں نے بھی۔ اس طرح ان کے آپس کے تعلقات کا نکھار یوں بھی قائم رہا لیکن انگریزوں نے تو ان دونوں اقوام میں جو انسانی احترام و محبت کا جذبہ تھا اسے بھی اپنے مقاصد کے تحت ختم کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں لڑا کر اپنی حکومت کو مستحکم کر سکتے ہیں۔ اور واقعی ان کے طویل دورِ اقتدار کی وجہ صرف مغل اقتدار کا زوال ہی نہیں بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی اعلیٰ فرائض سے غفلت بھی ہے۔ لیکن اس کے باوجود آزادی کی جد و جہد میں سب کی کوشش ایک سی تھی۔ آہستہ آہستہ اس اتحاد میں بھی فاصلے کی دیواریں اٹھنے لگیں اور "ہندو مسلمان بجائے انگریزی حکومت کے خلاف لڑنے کے آپس میں لڑنے لگے۔ فرقہ وارانہ فسادات مختلف مقامات پر ہوئے۔۔۔۔ ہندو مسلمان ایک دوسرے سے کافی الگ ہو گئے زیادہ تر باتیں مذہبی نقطۂ نظر سے سوچی جانے لگیں۔۔۔۔ مدتوں سے بزرگانِ دین اور شاہان و مہاراجگان نے جو شعوری و غیر شعوری طور پر ہندو مسلمان کو ایک کرنے کی کوشش کی تھی وہ بھی پسِ پشت پڑ گئی۔ صرف مذہب کو پیش پیش رکھا گیا۔[۱] کانگریس پورا ملک چاہتی تھی جبکہ مسلم لیگ انگریزوں کے علاوہ ہندوؤں سے بھی مسلمان علاقوں کی مکمل آزادی کی خواہش مند تھی۔ آخر بڑی جد و جہد اور بہت سی قربانیوں کے بعد آزادی کا مطالبہ تسلیم ہوا، لیکن فیصلہ اس طرح کیا گیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی آپس کی کھٹ پٹ ختم نہ ہو اور وہ آپس میں الجھتے

۱۔ ڈاکٹر اعجاز حسین۔۔۔ "اُردو ادب آزادی کے بعد"، ص۔ ۴۵

رہیں۔ "انگریز سامراجی حکومت کا بھی منشا یہی تھا کہ ہندو مسلمان آپس میں کٹ مریں تاکہ دنیا دیکھ لے کہ انگریز جو آزادی ہندوستان کو نہیں دے رہے تھے اس کی مصلحت یہ تھی کہ یہ لوگ انتظام حکومت کے قابل نہیں تھے۔"[1] اور واقعی انگریزوں نے یہاں کے بیشتر لوگوں کے ذہنوں اور افکار پر سیاسی ایٹم ڈال دیا تھا اور آخر ۲۴ سال بعد وہی ہوا جس کا انگریز مدتوں سے منتظر تھا۔ ہندوؤں کی حمایت سے پاکستان کا ایک حصہ کٹ کر بنگلہ دیش بن گیا۔ لیکن یہ بات مقالے کے اس باب سے تعلق نہیں رکھتی۔ ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ آزادی اور اس کے بعد کے حالات سے ہمارا ادب اور خصوصاً شاعری کس طرح اور کس قدر متاثر ہوئی۔

تقسیم کے فوراً بعد فرقہ وارانہ فسادات اور قتل و غارت گری شروع ہو گئی۔ مکانات جلائے گئے۔ معصوم بچوں کو والدین کے سامنے قتل کیا گیا اور عورتوں کے سامنے ان کے وارثوں کا خون بہا کر خود ان پر بھی ظلم کی انتہا کر دی گئی۔ اس وقت کی سب سے تکلیف دہ حقیقت آبادی کا تبادلہ تھی جو عام انسان کی قربانیوں کے رجحان کے باوجود بے حد کربناک تھی۔ اپنا گھر، اپنے دوست، اپنے مناظر چھوڑ کر نئی جگہ کے ماحول اور مناظر سے فوراً ہی دل لگ جانا آسان نہیں ہے پھر وہ قدریں وہ معیار جن میں وہ پروان چڑھے ان کو چھوڑنا تھا اور مسلمانوں کو تو خاص طور پر ایک نیا اور اعلیٰ نظام اقتدار بنانا تھا لیکن اتنے ڈھیر دکھوں کے اندھیرے میں ایک تیز چمکتی کرن ضرور جھلملا رہی تھی۔ وہ تھی امید کی کرن۔ "تقسیم ملک کے بعد جب فسادات اور آبادی کا تبادلہ شروع ہوا تو ہندو، سکھ اور مسلمان بڑی بڑی امیدیں لے کر اپنے اپنے نئے وطن کی طرف روانہ ہوئے تھے۔ ان کے

---

[1] ڈاکٹر اعجاز حسین: "اردو ادب آزادی کے بعد"، ص۔ ۴۷

سامنے وہ قربانیاں تھیں جو انہوں نے اس وطن کے حصول کے لئے دی تھیں، اور وہ توقعات تھیں جن کا خوش آئند تصور یار باران کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔[1] لیکن قائد اعظم جیسی عظیم شخصیت کی وفات کے بعد اقتدار کی ہوس سب اعلیٰ افکار، سوچوں اور تصورات کو لے ڈوبی۔" ان تمام حالات کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دونوں مملکتوں کے عوام میں ایک ذہنی بے چینی اور ایک سماجی اضطراب محسوس ہوتا ہے۔ اس کی بڑی ذمہ داری معاشی بدحالی پر ہے۔ پھر یوں بھی لاکھوں انسانوں کی تباہی اور بربادی نے ان کے حساس ذہن کو ایک عظیم معاشرتی تغیر اور انسانی غم سے پُر کر دیا۔ ملک میں ایسے خانماں برباد مہاجرین کا تانتا بندھ گیا جو اپنا گھر بار سب کچھ لٹا کر یہاں آئے تھے۔[2] سیاسی حالات یوں تھے کہ اس میدان میں جس کا بھی ایک قدم سما سکتا تھا وہ پورے میدان پر قبضہ کی سازشیں شروع کر دیتا۔ ان حالات میں شاعر کو جہاں لٹے پٹے تباہ حال دکھی لوگوں کا دکھ تھا وہاں اسے یہ احساس بھی تھا کہ انہیں وہ نئی خوشیاں اور سکھ نہیں مل رہے ہیں جن کے وہ حق دار تھے یا جن کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا۔ اس پر کچھ شاعروں نے ان حالات کا مقابلہ کرنے، ان پر تنقید کرنے اور ان کی اصلاح کرنے کی فکر کی۔ کچھ شروع ہی سے اس دکھ میں اتر کر صرف غم زدہ ہو کر رہ گئے۔ آزادی اُن کو دھوکا نظر آنے لگی اور وہ افسردہ ہو کر کہنے لگے:

"وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں"

اور یہ کہہ کر: کہاں سے آئی نگارِ صبا کدھر کو گئی

ابھی چراغِ سرِ رہ کو کچھ خبر ہی نہیں

---

[1] ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، "نقوش" اکتوبر، نومبر ۱۹۵۲ء (اردو غزل)، ص - ۴۳

[2] احمد ندیم قاسمی، "نگار" سالنامہ ۱۹۶۵ء (جدید شاعری آزادی کے بعد) ص ۳۹

یہ بھی کہا کہ ؎ ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

فیضؔ نے اپنا تاثر یوں بیان کیا تو ندیمؔ نے انگریز سے دھوکا کھا جانے کا ذکر اس طرح کیا:

پھر بھیانک تیرگی میں آ گئے ہم گجر بجنے سے دھوکا کھا گئے
کس تجلی کا دیا ہم کو فریب کس دھندلکے میں ہمیں پہنچا گئے

(احمد ندیمؔ قاسمی)

فریب کھا ہی گئے اہلِ جستجو آخر
چراغ ڈھونڈنے آئے تھے، شام لے کے چلے (قتیل شفائی)

بہاریں لے کے آئے تھے جہاں تم وہ گھر سنسان جنگل ہو گئے ہیں
انہیں صدیوں نہ بھولے گا زمانہ یہاں جو حادثے کل ہو گئے ہیں

شہر در شہر گھر جلائے گئے یوں بھی جشن طرب منائے گئے

(ناصر کاظمی)

یوں شعرا کو محسوس ہوا کہ اچھے حالات بنانے کے لیے انہیں بھی بہت کچھ کرنا ہے۔ پاکستان آنے والے شعرا کو ہر نئی چیز خود بنانا تھی۔ ترقی پسندوں کی مضبوط اور با اثر تحریک جو ان نئے مطالبوں کو پورا کر سکی تھی، اپنے آپس کے نظریاتی جھگڑوں میں بکھر گئی اور سوائے چند ایک کے باقی سب شعرا اس تحریک کو عملی طور پر جاری نہ رکھ سکے۔ فتح محمد ملک کا کہنا ہے کہ ترقی پسند شاعروں کے لئے تنقیدی ہدایت نامے مرتب کرنے والے، آزادی کے تقاضوں کا صحیح شعور حاصل نہ کر سکے اس لئے طلوعِ آزادی کے فوراً بعد یہ تحریک ختم ہو گئی۔ بہت بعد تک جیسے آوازِ رحیل کارواں سمجھا جاتا رہا وہ

صرف ایک درماندہ رہرو۔۔۔۔۔ احمد ندیم قاسمی کی صدا لئے دردناک تھی"[1] اصل میں تحریک کی تنظیم ختم ہوئی تھی مگر تحریک کے اثرات نہیں تھمے تھے۔ "ترقی پسند تحریک کے بعض جذباتی اور انتہا پسند نوجوانوں نے محض نعرہ بازی ہی کو سب کچھ سمجھ لیا۔ انہوں نے مقصد کے مقابلے میں فن کو زیادہ اہمیت نہ دی اور ہنگامی اور وقتی تبلیغ کو ترقی پسندی سمجھ کر اس تحریک کو خاصا ضُعف پہنچایا لیکن سلجھے ہوئے دانش دروں نے افراط و تفریط سے دامن بچایا۔ وہ داخلیت کے ساتھ ساتھ خارجیت کی عکاسی کے علمبردار ہیں۔ ماضی سے رابطہ رکھتے ہوئے اور پُرانی مثبت قدروں کو زندہ رکھتے ہوئے جدید رجحانات اور نئی اقدار کو اپنانے کے قائل ہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ حیات و کائنات کے رشتوں سے اغماض برت کر اور قدم قدم پر پھیلی ہوئی برہنہ حقیقتوں سے نظریں چرا کر کوئی فن کار بھی پورے خلوص سے فن کی خدمت کا دعویٰ نہیں کرسکتا، نہ ہی اس چیز کے بغیر فن میں وہ تاثر پیدا ہوسکتا ہے جو اسے دل نواز، ہمہ گیر اور زندگی آموز بنائے۔ وہ اظہار کی بے ساختگی کے ساتھ ساتھ سماجی شعور کو بھی شعری تخلیق کے لئے لابدی کہتے ہیں۔ غمِ جاناں اور غمِ دوراں کا حسین امتزاج ان کے فن کا طرۂ امتیاز ہے۔ انسانیت کی اعلیٰ قدروں کا حصول ان کا آدرش ہے اور ایسے معاشرے کا قیام ان کا مقصد ہے جس میں طبقاتی تفریق نہ ہو، سماجی اُونچ نیچ نہ ہو اور اقتصادی ناہمواری نہ ہو"[2] اور ان خیالات کا شاعری میں اظہار بھی کیا جا رہا تھا۔ اسی طرح کے چند ایک شعرا ایسے تھے جنہوں نے ترقی پسند رجحان کو نہ صرف آج تک برقرار رکھا ہوا ہے بلکہ اس صحت مند رجحان سے نئی نسل کو متاثر بھی کیا ہے۔ آزادی سے قبل

---

[1] فتح محمد ملک "تعصبات"، ص ۱۰۳

[2] فارغ بخاری "دو نئی قدریں"، فکرِ جدید نمبر، نومبر ۶۶ء آج کا شعری ادب، ص ۱۲۸ - ۱۲۹

ہی شاعری میں اس تحریک کا ردِعمل بھی شروع ہو چکا تھا اور بعض رومانی خصائص کے شعرا ابھرنے لگے تھے۔ رومانویت کا ایک عنصر حالات سے فرار بھی ہے اور اسے کسی قسم کے اصول اپنانا بھی پسند نہیں۔ رومانوی "وقت کی پابندی کرنے اور وعدے کو پورا کرنے کے مخالف ہوتے ہیں[1] وہ مکمل "آزادی" کے خواہش مند ہوتے ہیں اور ایسے حالات میں جب لوگ پابندیوں کی حد بندیوں میں چکر کاٹ کاٹ کر الجھ جاتے ہیں تو سب زنجیریں توڑ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ ایسے میں انہیں آخر کار رومانوی فضاؤں اور رومانوی افکار میں گھر کو ہی سکون ملتا ہے۔ اس لئے اس رجحان کی مقبولیت ہوتی ہے جبھی تو اس وقت نہ صرف ترقی پسندوں کے ردِعمل میں بلکہ اردگرد کے حالات سے بغاوت کرنے کی خواہش نے رومانویت کو بے حد مقبول بنا دیا۔ اور یوں شعروادب میں ایسے رومانوی افکار سمٹ آئے جن پر مغربی اثرات کا پرتو تھا۔

جدلیاتی عمل کے تحت ترقی پسند تحریک کے رجحان اور حلقۂ اربابِ ذوق کی نظم گوئی کے رجحان کے ملاپ سے ایک نئی شے کا وجود میں آنا لازمی امر تھا۔ اب غزل تو کسی صورت میں نئی چیز نہیں کہلا سکتی۔ اس کا سانچہ صدیوں پہلے بن چکا تھا لیکن کیسی عجیب بات ہے کہ غزل کا مخصوص مزاج جسے کافی حد تک اقبال اور ترقی پسندوں نے بدل دیا تھا، اب یوں واپس آئی کہ پرانی صورت میں سے ایک بالکل نئی صورت کی کونپل پھوٹی۔ یہ کونپل اقبال اور فراق کی شاعری میں پھوٹ آئی تھی اور اسے پروان چڑھانے کا کام ندیم اور فیض نے انجام دیا تھا لیکن اس کو تازہ دم کرنے کا سہرا ناصر کاظمی کی غزل کے سر ہے۔ ہمیں اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ جو غزل دوبارہ اپنے زندگی سے بھرپور سانسوں کی مہک بکھرانے لگی تو اس کو یہ نئی زندگی حاصل کرنے میں کن حالات

---

[1] ناصر کاظمی، "ادبِ لطیف"، (مجھے اختلاف ہے) ص۔ ۹

سے گزرنا پڑا اور اسے کن چیزوں اور کن شاعروں نے سہارا دیا۔

سب سے پہلے تو ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آزادی کے وقت شعر و ادب میں کون سے غالب رجحان پرورش پا رہے تھے۔ اس وقت تک اُردو شاعری کی سلطنت میں وہ شاعر بھی تھے جن کے نزدیک صرف اور صرف ان کی اپنی ذات قابل توجہ تھی۔ ان کے نزدیک حُسن اور خوبصورتی کے تصورات کا بیان ہی شاعری تھا۔ وہ حقیقت کا بیان بھی اس طرح کرتے کہ اشعار کے معنی صرف انہی کے ذہنوں میں محفوظ ہوتے۔ عام قاری اپنے آپ کو شاعر کے قریب محسوس نہ کرتا۔ "علامت پسند تحریک، کے بعض بے راہ رو شعراء نے شاعری کو اتنا نجی معاملہ بنا دیا ہے کہ قارئین اس کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہیں ...... اس تجریدی شاعری کے مقابل میں انتہا پسند نوجوانوں نے اپنے ماضی اور اپنی شاعری کی تاریخی روایات سے یکسر قطع تعلق کر کے نئے افق تک رسائی حاصل کرنے کی ٹھانی نتیجہ یہ کہ درمیان میں خلا رہ گیا جس پر پُل باندھے بغیر قارئین کا اس پار پہنچنا محال ہے[۱] لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان شعراء کی نظمیں اُردو شاعری میں اچانک ایک نئی دنیا کی طرف دریچہ کھولتی ہیں۔ یہ دریچہ میراجی سکول کی نظم نگاری تھی۔ "اصل بات یہ ہے کہ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۶ء تک، دس سال کا عرصہ اُردو شاعری کی تاریخ میں بغاوت اور تجربوں کا ایک طوفانی دور ہے موضوعات میں بغاوت اور تجربوں کا سلسلہ تو دور تک پہنچتا ہے۔ ہیئت میں بغاوت کا احساس اس کے بعد پیدا ہو گیا۔ وہ پہلے پہل چند انفرادی کوششوں تک محدود رہتا ہے لیکن ترقی پسند تحریک کے ساتھ یہ بغاوت پھوٹ پڑتی ہے۔ سانیٹ، نظم غیر آزاد، گیتوں، نئی بحروں سے نئے پیمانوں

۱۔ فارغ بخاری "نئی قدریں" فکر جدید نمبر۔ نومبر ۶۲ء (آج کا شعری ادب) ص ۱۲۹

کے تجربے شروع ہوتے ہیں[1] لیکن ان ترقی پسند شاعروں میں سے کئی اچھے شاعر نظموں کے ساتھ غزلیں بھی کہتے رہے۔ خاص طور پر فراق، فیض، ندیم اور ظہیر کاشمیری کی غزلیں۔ ترقی پسند شعرا اردگرد کے ماحول کا بیان کرتے اور اس ماحول کو، اس زندگی کو سنوارنے کی کوشش کرتے۔ ان کا مقصد تھا کہ معاشی مساوات اور معاشرتی خوشحالی کے لئے زمین ہموار کی جائے اور سیاسی طور پر آزادی حاصل کی جائے اور ان کے مقصد کی تان (گو کہ سیاسی بھی تھی لیکن زندگی کا درد اس میں ضرور سمٹ آیا تھا چنانچہ ۱۹۴۷ء کے بعد......... (انہوں) نے انسان دوستی کا حق ادا کیا اور قابلِ قدر چیزیں لکھیں[2] اس ادب پر بڑا اعتراض یہ بھی ہے کہ اس نے اپنا موضوع زیادہ تر سماج کی اخلاقی اور معاشرتی خرابیوں کو بنایا ہے اور ان کو وہ عریاں پیش کرتا ہے .... قاضی عبدالغفار صاحب اپنے مضمون میں اس اعتراض (کہ آخر کیا ضرور ہے کہ دنیائے ادب صرف ایسے ہی موضوعات کو اپنے لئے مخصوص کرے) کا جواب یوں دیتے ہیں کہ "یاد رکھیئے کہ جو قومیں غلامی کی حالت میں درماندہ ہوں ان کو ادب اور آرٹ کے محض شاعرانہ افکار کی جنت میں قدم رکھنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ یہ ایک بے محل عیاشی ہے۔ یہ بھی یاد رکھیے کہ ہمارا نیا ادب غلامی، سماجی پستی، احتجاع اور بھوک اور اس سے پیدا ہونے والی اخلاقی خرابیوں کے ماحول میں پیدا ہو رہا ہے۔ اگر یہ ادب فطرتی ہے تو وہ اسی ماحول کے حقائق کو بے نقاب کرے گا، الف لیلیٰ یا داستانِ امیر حمزہ یا بوستانِ خیال تو نہیں لکھ سکتا[3] یہ الگ بات ہے کہ ہو سکتا ہے یہ سب داستانیں بھی انہیں

---

[1] ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ "غزل اور متغزلین" ص ۲۵۵

[2] شہاب جعفری "ادبِ لطیف" دسمبر ۱۹۶۱ء (جدید ادب)

[3] قاضی عبدالغفار۔ "ادبِ لطیف" سالنامہ ۴۴ ۱۹ء (جدید ادب)

حقائق کو نقاب میں چھپائے ہوئے ہوں لیکن اتنا واقعی درست ہے کہ فطری ادب وہی ہے جو ماحول کے حقائق کو بے نقاب کرے، چاہے یہ وسیع پیمانے پر ہوں چاہے محدود۔ ترقی پسند شعرا بیشتر نظمیں ہی لکھ رہے تھے لیکن انہوں نے غزل کو بالکل ہی چھوڑ نہیں دیا تھا۔ ان کے پاس غالبؔ اور اقبالؔ کی غزل کا سرمایا تھا۔ اس لئے وہ غزل میں بھی اپنے مخصوص خیالات کا اظہار کر کے اس کو وسعت بخش رہے تھے۔ ۱۹۵۳ء کے ایک مضمون میں ظ۔ انصاری لکھتے ہیں کہ "فال نیک ہے کہ ترقی پسند نوجوان شاعروں نے اس راز کو پالیا ہے۔ وہ نظموں اور غزلوں کے موضوعاتی اور ہئیتی فرق کو سمجھنے لگے ہیں لہٰذا سمجھ کے ساتھ ساتھ ہمارے سامنے پچھلے پانچ چھ سال سے بڑی خوش گوار غزلیں آنے لگی ہیں جن میں غزل کی تندرست اور حسین روایات سموئی ہوئی ہیں اور اسے صحیح سمت میں بڑھا رہی ہیں"[1] یوں ان دو مختلف رجحانات رکھنے والے شعرا کی جرأت نے غزل کو نہ صرف زندگی سے قریب کر دیا بلکہ اسے اتنی تازگی بھی بخش دی کہ وہ آئندہ کسی نئے اور لمبے سفر کے لئے تیار ہو سکے۔

آزادی کے بعد زندگی کی تلخ حقیقتوں نے جس طرح شعرا کو جسمانی جھٹکوں کے علاوہ ذہنی جھٹکے دیئے اور جھنجھوڑا اس کی وجہ سے سب اس تلخ اور کڑوی زندگی کی تلخیاں محسوس کرنے لگے۔ زندگی کے ان پہلوؤں کی طرف سب شعرا خصوصاً انقلابی اور ترقی پسند شعرا نے توجہ دلائی۔" انقلابی شاعری جلد ہی جدید اُردو شاعری کی فطرتِ ثانیہ بن گئی۔ ترقی پسند مصنفین سے متعلق شاعروں کو قنوطیت کی بجائے امید، اور وہم کی جگہ ایک ایسا یقین ملا جس نے

---

[1] ظ۔ انصاری: "۱۹۵۳ء کا بہترین ادب"، (غزل باقی رہے گی) ص ۔ ۵۷

کم از کم وقتی طور پر سارے مسائل حل کر دیئے"[1] وہ شعرا بھی جو ترقی پسندوں کی مخالفت میں اس بات پر یقین نہ رکھتے تھے کہ حالات کا بیان شاعری میں کیا جائے، غزل میں ایسے ہی اشعار کہنے لگے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ اس وقت سب کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ جو آنکھیں بند کئے ہوئے تھے وہ جاگ اٹھے اور جو جاگ رہے تھے وہ لپک کر آگے بڑھ آئے۔ سبھی تیز چمکتی دھوپ میں سارے منظر اور سب چیزیں دیکھ رہے تھے اور باوجود اس کے کہ "دراصل یہ دور بھی عبوری تھا۔ بے یقینی، عدم تحفظ اور تشکک کی فضا عام تھی چنانچہ غزل گو بھی جذباتیت اور ماحول سے بے زاری اور شدید کرب میں مبتلا تھے۔ مگر با ایں ہمہ جدید معیشتی زندگی اور زندگی کی کڑی دھوپ کی وجہ سے اب غزل گو اپنے مخصوص سحر آگہی حصار اور خوابی خول سے باہر نکل آئے تھے"[2] اور مایوسی اور احساسِ کمتری کی دیوار کو ڈھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

پھر آہستہ آہستہ کچھ لوگ تو دھوپ چلتے ہوئے امن وسکون کا حق مانگنے لگے اور کچھ لوگ ایسے تاریک حبس زدہ جنگلوں میں اتر گئے جو تیز لُو سے بھی زیادہ تباہ کن تھے۔ اور کچھ وہیں دھوپ میں بیٹھ کر بھی آنکھیں بند کر کے فردوس نما فضاؤں میں پہنچ گئے۔ سوچنے کا انداز سب کا الگ الگ تھا لیکن شروع شروع میں اصل بات سبھی کی ایک ہی تھی یعنی آزادی کے بعد تبدیل شدہ سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی حالات، جن کی اس صورت میں بالکل توقع نہیں کی جا رہی تھی۔ ایسی فضا میں حساس شاعر بھی بے چینی اور بے سکونی محسوس کر رہا

---

[1] ڈاکٹر محمد حسن۔ "شاہراہ" جون ۱۹۶۰ء۔ ص۔ ۲۰

[2] سلطان رشک۔ "نیرنگ خیال" غزل نمبر ص ۱۱۹

تھا۔ سب باتیں کرنا چاہ رہے تھے۔ جذبات کا اظہار چاہتے تھے۔ ایسے میں نظموں سے زیادہ غزلوں نے ان کو اظہار میں سہارا اور مدد دی۔ ایک طرف تو "نئی قدروں کی تلاش کے اس دور میں فراریت کی آغوش میں پناہ لینے کی کوشش میں ایک اہم بات ہوئی کہ غزل کو سنبھالا مل گیا"[1] اور دوسری طرف وہ شعرا جو زندگی کے مسائل کا بیان کرنا چاہتے تھے ان کے لئے مسئلہ یہ تھا کہ وہ کھل کر سب کچھ نہ کہہ سکتے تھے۔ اس لئے ان کے لئے غزل کے لطیف اور پُر معنی کنایئے، استعارے اور تشبیہیں بہت مددگار ثابت ہو سکتی تھیں۔ یوں بھی "ہندوستان و پاکستان کی حکومتیں اب بدیسی نہ تھیں۔ ان کے خلاف بیباکی و دریدہ دہنی سے کچھ کہنا بغاوت کے مترادف سمجھا جا سکتا تھا اور جی بھی نہیں چاہتا تھا کہ اقوام عالم کے سامنے اپنی نئی حکومتوں کی خامیوں کو شدومد سے بیان کر کے اس طرح بدنام کیا جاتے کہ وہ دنیا کی نظروں میں ابھی سے ذلیل و ناکارہ نظر آنے لگیں[2]" اور تیسری اہم وجہ غزل کی مقبولیت کی یہ تھی کہ اس وقت کے زمانے کے حالات ایسے تھے کہ وہ سوچوں کو پرانی مٹتی ہوئی تہذیبی اقدار کی تلاش میں میرؔ کے زمانے تک لے گئے اور انہیں احساس ہوا کہ میرؔ کے زمانے کے دکھ آج کے دکھوں سے ملتے جلتے ہیں۔ اس طرح وہ میرؔ کو اپنے ساتھ لئے لئے اپنے زمانے تک لے آئے۔

آزادی کے فوراً بعد پہلے تو آزاد ہونے کی خوشی میں سب کچھ بھلا دیا گیا اور صرف آزاد ہونے کا ذکر کیا گیا، لیکن جب اصل باتیں سامنے آئیں تو ایک طرف تو مایوسی نے الجھے الجھے شکایتی لہجے کو جنم دیا جس میں طنز اور جھنجھلاہٹ بھی تھی۔

۱۔ احمد ندیم قاسمی۔ "نگار" (اردو ادب، آزادی کے بعد) ص ۱۴۱

۲۔ ڈاکٹر اعجاز حسین۔ "اردو ادب آزادی کے بعد"

وہ بات، سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے (فیض)

اتنی ارزاں تو نہ تھی درد کی دولت پہلے
جس طرف جائیے، زخموں کے لگے ہیں بازار (ندیم)

کچھ اس طرح سے بہار آئی ہے کہ بجھنے لگے
ہوائے لالہ و گل سے چراغِ دیدہ و دل
رواں ہے قافلۂ بے درا و بے مقصود
جو دل گرفتہ ہیں راہی تو رہنما غافل (حفیظ ہوشیارپوری)

یہ راہرو تھے کبھی راہِ زندگی کا سراغ
یہ راہرو کہ بھٹکتے ہیں رہنما کے لئے (صوفی تبسم)

کہہ رہا ہے فضا کا سناٹا — راستے میں نہ کارواں ٹھہرے
آپ کو کارواں سے کیا مطلب — آپ تو میرِ کارواں ٹھہرے
(باقی صدیقی)

اور دوسری طرف احساس شکست اور احساس محرومی نے ساری فضا کو افسردہ کر دیا۔ شاعری میں افسردگی کے سب سے بڑے نمائندہ میر تقی میر تھے۔ یوں میر کی طرف مراجعت سے نہ صرف میر کا لب و لہجہ پھر سے گونج اٹھا بلکہ قدیم بچھڑتی ہوئی روایتیں بھی مکمل طور پر فراموش ہونے سے بچ گئیں۔ اس دور میں غزل کے پرانے

اسالیب کے مطالعے سے نئی روشیں ڈھونڈنے کی خاص کوشش ہوئی ......

اس رجحان کی ایک مثال میرؔ کی تقلید یا صحیح الفاظ میں میرؔ کا اعتراف ہے[۱]" میرؔ مانوس نظر آیا۔ وہ اس زمانے میں چلا آیا۔ مگر اس مانوسیت میں ایک حصّہ تقلیدی ذہنیت کا بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رنگِ میرؔ میں طبع آزمائی تو بہتوں نے کی لیکن کامیابی کم شعرا کو نصیب ہوئی۔ زیادہ تر شعرا نے میرؔ ہی کے بعض مضامین کو ان کے مخصوص الفاظ، فقیرانہ لہجے اور لمبی بحروں میں ادا کرنے پر اکتفا کر لیا[۲]" ان کے مزاج میرؔ کے مزاج سے مماثل نہ تھے۔ نہ ہی وہ میرؔ کی طرح کا طرزِ احساس رکھتے تھے۔ وہ میرؔ کے صرف طرزِ اظہار کو اپنانے کی بجائے اس کی باتوں کے چربے بھی اتارنے لگے۔ اور یوں اپنے بڑے فن کار کی ناکام نقل کرنے کی وجہ سے وہ خود قدم قدم پر ٹھوکر کھانے لگے۔ اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ " یہ مصدقہ حقیقت ہے کہ بعض روائتوں کی ہر حالت میں حفاظت کرنی چاہیئے کیونکہ ان کی قوتِ حیات ہزاروں سالہ انسانی تجربے پر مبنی ہے[۳]" لیکن جدید شاعری میں قدیم شاعری کو ہو بہو کہہ دینے کا مطلب تو یہ ہوا کہ زمانہ آگے بڑھا ہی نہیں۔ جدید زمانے اور قدیم زمانے میں فرق تو ہوتا ہے۔ آج کل تو انسانی تہذیب کا ارتقا لمحہ بہ لمحہ بھی ہو رہا ہے کل کے دن سے آج کا دن مختلف ہے اور آنے والا کل آج سے بھی مختلف ہو گا۔ اتنے تیز رفتار عہد میں " ادب کی کوئی بھی صنف ہو جب وہ ہدایت کی پابند اور لکیر کی فقیر ہو جاتی ہے تو اس میں نہ تازگی رہتی ہے نہ زندگی اور آنے والی

---

[۱] ڈاکٹر سید عبد اللہ "خیابان" (پاکستانی ادب کے دس سال) ص۔ ۲۱۰

[۲] نظیر صدیقی۔ "خیابان" اردو غزل کدھر؟) ص ۳۶۹

[۳] احمد ندیم قاسمی "نگار" سالنامہ ۶۵ء (جدید شاعری آزادی کے بعد) ص۔ ۴۴

نسل، بشرطیکہ اس میں کچھ شعور ہو، اس مُردے کو اپنے شانوں سے اتار پھینکتی ہے۔"[1]
یہ درست ہے کہ میرؔ کی تقلید میں بعض اچھی غزلیں بھی کہی گئیں۔ مثلاً میرؔ کے مقلدین میں سے
"مختار صدیقی کے مجموعۂ کلام 'منزلِ شب' کا وہ حصہ جو رنگِ میرؔ والی غزلوں میں
ایک ایسی لذت ہے جس کی بنا پر ان غزلوں کو بار بار پڑھنے کے باوجود ذوقِ شعری کو
سیری نہیں ہوتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (لیکن) غزل کی میرؔ پرستی کو پاکستانیوں کی اس
ماضی پرستی کا جز و مان لینے کے باوجود جسے انتظار حسین بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں
اور اس کے جواز میں بڑی خوبصورت دلیلیں پیش کرتے ہیں، یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ غزل
میں میرؔ پرستی کا میلان کوئی مفید میلان نہ تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (کیونکہ) اس میں دورِ حاضر
کی غزل اور غزل گو دونوں کی انفرادیت بھینٹ چڑھتی جا رہی تھی۔"[2] ہاں اگر پرانے
اسالیب کو یوں اپنایا جائے کہ کوئی نیا لہجہ یا کوئی نیا اسلوبِ بیان وجود میں آجاتے
تو پھر تو یہ چیز بھی زندگی بخش ہوگی لیکن بلا مقصد اور بے معنی ماضی پرستی سے کچھ حاصل
نہیں۔ جدید شعرا میں سے فراقؔ کو میرؔ پسند آئے لیکن کیوں پسند آئے اس کی شاید
انہیں خود بھی پہچان کروانا مناسب نہ لگا۔ یوں فراقؔ نے جس سے بھی اثر لیا اسے
اپنی روح میں اتار لیا۔ ۷۴ء کے بعد کئی شعرا مثلاً ابنِ انشا، مختار صدیقی، شہرت بخاری
اور باقی صدیقی وغیرہ نے میرؔ کی طرف رجوع کیا۔ پھر خود ناصر کاظمی نے بھی میرؔ ہی کو
اپنایا۔ لیکن ان سب شعرا میں سے کامیاب وہی رہے جن کے مزاج میرؔ سے مماثل
تھے۔ جو میرؔ سے صرف ان کا طرزِ احساس لے آئے تھے۔ ان شعرا میں سے ناصر کاظمی
بھی اگر تقلید کرتے ہیں تو میرؔ کے طرزِ احساس کی نہ کہ طرزِ اظہار کی۔ اور اس کی وجہ یہ

---

[1] سید امجد الطاف۔ "ماحول" ۷-۶، (اردو غزل پاکستان میں) ص ۵۲

[2] نظیر صدیقی۔ "خیابان" (اردو غزل کدھر؟) ص۔ ۲۷۰

ہے کہ میرؔ اور ناصرؔ کے مزاجوں میں بہت مماثلت ہے۔

وہ شاعر جو نئی دنیاؤں اور نئی چیزوں کی تلاش میں رہتے تھے آزادی کے بعد ان کی انقلاب کی پکار کم ہو گئی اور انسانیت کا ماتم زیادہ ہو گیا۔ اب "ملک کی آزادی یا قوم کی آزادی کے ساتھ ساتھ فرد کی آزادی کا سوال بھی اُبھرا[1] اس کی وجہ یہ تھی کہ معاشرتی اور قومی جدوجہد کے بعد جب قومی نصب العین کا حصول ہو گیا تو اب ضرورت اس بات کی ہوئی کہ وہ لڑائی جو ذات سے باہر لڑی جا رہی تھی اسے محدود کر کے افراد کو ان کا مرکز بنا دیا جائے۔

۳۶ء کے بعد ادبی بغاوتوں کے جو طوفان بڑے زور سے اُٹھے تھے ان میں اعتدال کی کیفیت پیدا ہوئی، چنانچہ اس نئی فضا نے مصالحت اور مفاہمت کا رجحان پیدا کیا جس کا ایک خوشگوار پہلو یہ ہے کہ انتہا پسندی کی جگہ غور و فکر اور ملکی عناصر سے بیزاری کی بجائے ملکی اور قومی مزاج کو سمجھنے اور اس سے ہمدردی پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی ہے[2]

غزل جو عاشقانہ مضامین اور گُل و بلبل اور شمع و پروانہ کی کہانی کے سوا اور زیادہ نہیں جانتی تھی اسے نئی دنیاؤں سے اقبالؔ نے روشناس کرایا اور ۴۷ء سے کچھ عرصہ بعد تک غزل نئے رستوں پر چلتی ہوئی وسعتوں میں پھیل گئی۔ اب "غزل ایک ایسی صنف بھی معلوم ہوئی جو ایک قوم کی ذہانت و فطانت کی پیداوار ہے جس نے ہمیشہ نہ صرف اس قوم کی تہذیبی اور معاشرتی نشیب و فراز کا ساتھ دیا ہے بلکہ اس نشیب و فراز کی ترجمانی اور عکاسی بھی کی ہے۔ اس میں گل و بلبل اور شمع و پروانہ کی باتیں ضرور

---

[1] ڈاکٹر کریم الدین۔ "سیپ" (نئی شاعری میں تجربے) ص۔ ۲۶۲

[2] ڈاکٹر سید عبداللہ "خیابان" دسمبر ۵۴ء (پاکستانی ادب کے دس سال) ص ۲۰۱

ہیں لیکن ان کے پردے میں اس نے بہت کچھ کہنے کی کوشش کی ہے۔ معاشی، معاشرتی حالات کی تصویریں بھی کھینچی گئی ہیں۔ بدلتے ہوئے حالات کے زیرِ اثر افراد کی جذباتی اور ذہنی کیفیت کے نقشے بھی بنائے ہیں اور زمانے کے ہاتھوں پیدا ہوتے ہوئے نت نئے افکار و خیالات کی عکاسی بھی کی ہے"[1]۔ ۴۷ء کے بعد شعرا میں سے چاہے کوئی ترقی پسند تھا یا رومانوی یا کچھ اور، وہ حقیقت کی آگ کو اپنے اتنے قریب پا رہا تھا کہ اس کی تپش سبھی محسوس کر رہے تھے۔ "حقیقت پسندی نے محبت اور حُسن کے بارے میں بھی نیا تصوّر قائم کیا اور یہ نیا تصوّر جدید شاعروں میں کم و بیش سبھی نے اپنایا"[2]۔ ناصر کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے یہ تصوّر یوں اپنایا کہ اس کی غزل پر نہ ترقی پسندی کا لیبل لگ سکا نہ میر پرستی کا۔ اس کی فنی تجزیاتی قوت نے قدیم و جدید غزل کی روایات و رجحانات کو اس سلیقے سے آمیخت کیا کہ ناصر کا ایک اپنا اسلوب صورت پذیر ہونے لگا اور اس اُردو غزل میں اسلوب کی یہ انفرادیت قائم کرنا کوئی آسان بات نہیں جہاں میرؔ، غالبؔ، اقبال، فراقؔ، فیضؔ اور ندیمؔ کے سے قدآور غزل گو اپنی غزلوں کی صورت میں نہ صرف موجود ہوں بلکہ پڑھنے والوں کے ذہنوں پر چھائے ہوئے ہوں۔

اب تک کی غزل کے ساتھ ساتھ چلتے چلتے جب ہم اس مقام پر آتے ہیں تو جس طرح آج کے شہری آدمی کو اتفاقاً دیہات کی چاندنی راتیں، خوشگوار و خنک صبح اور ہلکے رنگوں میں ڈوبتے ابھرتے شام کے مناظر دیکھنے کا موقع ملے تو وہ مسحور ہو جاتا ہے اسی طرح قاری کو بھی غزل کی تیز چمکتی روشنیوں والی رنگ برنگی

---

[1] ڈاکٹر عبادت بریلوی "ماحول"۔ ۷۔ ۸ داردو غزل کے جدید رجحانات ، ص ۲۹

[2] ڈاکٹر محمد حسن "شاہراہ" فروری ۵۱ء جدید اردو شاعری ، ص ۱۸

اور مختلف سازوں کی آوازوں سے بھرپور دنیاؤں سے گزر آنے کا احساس ہوتا ہے اور اب اس کے سامنے جو وادی پھیلی ہوئی ہے اس میں ہلکے ہلکے رنگ اور دھیمی دھیمی موسیقی ہے۔ خاموشی اور تنہائی ہے۔ اُداسی بھی ہے لیکن ایسی اُداسی نہیں جو مایوس کر دے۔ بلکہ یہ اُداسی حقیقت کی پہچان کروا کر امید بھی دلاتی ہے اور یہی ہے ناصر کاظمی کی غزل کی وادی ۔۔۔۔ یہ نئی جگہ ہے۔ یہاں جو کچھ ہے پھول، پہاڑ درخت، ندیاں، رستے، یہاں کے لوگ، سبھی کچھ پہلے کے دیکھے بھالے ہیں لیکن پھر بھی یہ سب سے مختلف ہے تو آئیے اب ناصر کی وادیٔ غزل کی اس انفرادیت کو پانے چلیں۔

ناصر کاظمی کو سب سے پہلے جس نقاد کی تنقید نے مدد دی وہ تھے محمد حسن عسکری۔ رسالہ "ساقی" کی جھلکیوں میں انہوں نے ناصر کی آواز کے رسیلے پن اور اس کے موضوع کی گرفت کو نہایت سلیقے اور محبت کے ساتھ پیش کیا، مگر ان کے ساتھ ایک مشکل یہ تھی کہ وہ ادب میں حقیقت پسندی اور مقصدیت کے مخالفین میں شمار ہوتے تھے اس لئے انہوں نے ناصر کو حقیقت و مقصدیت سے بالکل الگ کر کے دیکھا۔ خود عسکری کا اسلوبِ تنقید اتنا خوبصورت تھا کہ انہوں نے قارئین کو بے حد متاثر کیا اور یہی وجہ ہے کہ آج بھی ناصر کو عسکری ہی کی عینک سے پہچاننے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بہر حال اہم بات یہ ہے کہ عسکری ہی نے ناصر کی عظمت کا سب سے پہلے اعتراف کیا اور یہ بڑی بات ہے۔

"قیامِ پاکستان کے بعد اردو غزل میں کئی نئی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ان میں سب سے پہلے جس آواز نے اپنی انفرادیت تسلیم کرالی وہ ناصر کاظمی کی آواز تھی۔ ناصر کاظمی، حفیظ ہوشیارپوری کے شاگردوں میں سے ہیں۔۔۔۔۔۔ ناصر کی غزلوں پر میرؔ، مصحفیؔ، غالبؔ، اقبالؔ، اور فراقؔ کے اثرات واضح ہیں لیکن اس کے باوجود

ان کی انفرادیت نمایاں ہے ان کی شاعری قدما کے گہرے مطالعہ اور فنی ریاضت کا ثبوت دیتی ہے[1]

ناصر کاظمی کے اس انفرادی مقام کے متعلق کچھ اور آرا بھی دیکھے لیتے ہیں۔

"۱۹۴۶ء میں جب ناصر کاظمی نے غزل اپنائی تو وہ اسے محض "تفریحی صنف" نہ سمجھتے تھے بلکہ ولی سے اقبال تک اُردو شاعری کا عہد بہ عہد سفر ان پر آئینہ تھا" اور یہ کہ .... "نئی غزل کی تاریخ میں ناصر کاظمی کا یہ کارنامہ یادگار رہے گا کہ انہوں نے ہر دو رویوں کو رد کر کے ایک نئے رویہ کو جنم دیا۔ ناصر کاظمی نہ تو اپنی تماش بینی کی نمائش اور دوسروں کی تفریح طبع کی خاطر غزل لکھنے والوں کے فریب میں آئے اور نہ فقط پابندیٔ اظہار کے زمانہ میں غزل کے رمز وایمائے سے کام نکال لینے والوں سے متعلق ہوئے بلکہ وہ یہ احساس لے کر اٹھے کہ جب تک غزل اہم ترین صنف سخن نہیں بن جاتی ملک سخن کا سماں سنسان رہے گا۔"[2]

"ناصر کاظمی نے غزل کی "تجدید" کی۔ ناصر کی غزلیں سپردگی، ربودگی، داخلیت، کھوئے کھوئے سے انداز، خود فراموشی اور نیم خوابی کے عالم کی عکاس ہیں۔ ناصر کا لب و لہجہ کلاسیکی غزل سے نکھر کر اور سجل ہو گیا ہے .... ناصر کے ہاں صرف تشبیہ و استعارہ کی تازگی اور تاثراتی تصویروں کا نیا پن ہی نہیں ہے خلوص کی مہک اور تجربے کی روشنی بھی ہے۔ یہ محض تقلید نہیں ہے تخلیق بھی ہے گو کہ اس کا دائرہ محدود ہے۔"[3]

۱؎ نظیر صدیقی۔ "فنون" جدید غزل نمبر ۶۹ء (جدید غزل ۔ پاکستان اور ہندوستان میں) ص ۱۶۸

۲؎ فتح محمد ملک۔ "تعصبات"، (غزل اور نئی غزل) ص ۔ ۱۵۷

۳؎ ڈاکٹر محمد حسن۔ "نقوش"، جون ۶۰ء (آج کی شاعری)

"ناصر کاظمی کی غزلیں فیض، حفیظ اور مجروح سے بالکل مختلف ہیں۔ ان کی حیثیت ایک نئی آواز کی ہے۔ انہوں نے جو عظیم تجربہ اُردو غزل میں کیا ہے، اس نے تو غزل کی فضا ہی کو بڑی حد تک بدل دیا ہے۔ ان کے یہاں دوسرے جدید غزل گو شعرا کی طرح غزل کی روایت کا عام ماحول نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں ایک نیا ماحول قائم کیا ہے۔ ایک نئی فضا تیار کی ہے اور اس میں بڑی حد تک ان کی اس نئی Imagery کو دخل ہے جس کا تار و پود انہوں نے اپنے گرد و پیش سے لیا ہے"[1]

ناصر کاظمی سب سے پہلے فراق سے متاثر ہوئے۔ اس کا انہوں نے بے شک کھل کر اظہار نہیں کیا لیکن ان کے اشعار اس کے گواہ ہیں۔ "ناصر کاظمی کا طرزِ احساس شروع شروع میں فراق سے متاثر ہوا۔ اس میں بھی "پیراڈکس" کی جھلک ہے:

اے دوست ہم نے ترکِ محبت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

لیکن یہ پیراڈکس بے کار Idle ہیں۔ اس بدلتے ہوئے انسان کی زندگی کے سایوں اور روشنیوں کا عکس ہے"[2]۔ پھر ناصر نے فراق کی غزلوں کا انتخاب "غزل" کے عنوان سے کتابی صورت میں چھپوایا۔ بیگم ناصر کاظمی کا کہنا ہے کہ فراق کو وہ بے حد پسند کرتے تھے۔ "ناصر کاظمی نے فراق سے کیفیت نمائی کا انداز لے کر اسے جدید غزل کے ایک نئے دور کا نعرۂ جہاد بنا دیا۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فراق تو خیر بحرِ روایات کے شناور ٹھہرے خود ناصر کاظمی بھی میر سے لے کر

---

[1] ڈاکٹر عبادت بریلوی "ادبِ لطیف" ۵۵ء (اُردو غزل میں ہیئت کے تجربے)

[2] جابر علی سید "فنون" جدید غزل نمبر ۶۹ء (جدید نظم، جدید غزل اور جدید طرزِ احساس)

اقبال تک مختلف لہجوں کو اپنے لہجے میں جگہ دیتے رہے ہیں[۱]۔ لیکن یہی تو عجیب بات ہے کہ ناصرؔ ان سب لہجوں کے آرکسٹرا میں اپنی آواز نمایاں رکھتے ہیں۔ ان کی صدا دبی نہیں اور اس کے باوجود وہ بلند اور تیز نہیں۔ دھیمے دھیمے سُروں میں، نرمی سے کچھ بتاتی ہوئی، کچھ سمجھاتی ہوئی آواز۔ لیکن اس آواز کی بھی ایک گھمبیرتا اور گونج ہے۔ اور یہی اس کی پہچان اور یہی اس کی انفرادیت ہے۔

اصل ناصرؔ کاظمی، ۴۷ء کے بعد سامنے آتا ہے ایک پُر اعتماد اور باوقار غزل لئے ہوئے۔ ناصر اپنے آپ کو ترقی پسندی سے الگ بتاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو رومانوی ظاہر کرتا ہے لیکن بات ترقی پسندوں ہی کی سی کرتا ہے۔ دراصل وہ حقیقت بھی ہی ایسی قیامت کی کہ نہ ہوتے ہوئے بھی سب ایک ہو گئے تھے۔ یہ اختلافات تو کچھ عرصے بعد واضح ہوئے۔ اس وقت جب زندگی کو سمجھنے کا مرحلہ آیا تب ہر ایک نے اپنے اپنے انداز میں اسے سمجھا اور اس کی ضرورتوں کا ذکر کیا۔ کچھ لوگوں نے سخت لہجے میں بات کی، کچھ نے نرم لہجے میں، کئی شاعروں نے بات سمجھ کر اسے سوچا اور نئی تجویزیں دیں اور کئی دوسرے شاعروں نے بات سمجھی اور اس کی طرف اشارہ کر دیا اور بس۔ یہی آپس کی کشمکش تھی جس کے ٹکراؤ کے بعد غزل پھر سامنے آ گئی یعنی الگ الگ رجحانات غزل کے حق میں بُرے نہ تھے۔ ناصرؔ کاظمی کو رومانوی شاعر کہا جاتا ہے لیکن اس کی رومانویت کی دھند کے پیچھے حقیقت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ ناصرؔ کے سے حسّاس اور باشعور لوگ ہی ایسے ہو سکتے ہیں جو اس سمندر کا شور بھی سُن سکیں ورنہ تو رنگ برنگی دھند ہے اور کچھ نہیں۔ اور یہی صحت مند فکر ہے جو پُر اعتماد ناصر سے کہلواتی ہے کہ "مجھے تو ہر ایسے شخص کی دوستی پر شبہ ہونے

---

[۱] حنیف فوق۔ "فنون" جدید غزل نمبر ۶۹ء (اُردو غزل کے نئے زاویے)

لگتا ہے جو ہر بات کے حق میں ہو اور دوسروں کی مخالفت مول لینے کا جوکھم نہ لے سکے۔ ہر چیز کی مخالفت کرنا بے شک ایک ذہنی بیماری کی علامت ہے مگر ہر بات کے حق میں ہونا بھی ذہنی افلاس کی دلیل ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ (ادر)۔۔۔۔ جو ادیب کسی بات کا مخالف نہیں میں اسے سرے سے ادیب ہی تسلیم نہیں کرتا۔"[1]

ناصر نے اپنی خوبصورت اور دلنشیں غزل اس وقت کہنا شروع کی جب شاعری پر نظم کی حکومت تھی۔ ایک تو نظم کی حکمرانی میں غزل کو اپنانا ہی بڑا کام تھا پھر یوں اپنانا کہ اس کی شان میں اضافہ ہو تو یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ وہ ناصر کاظمی جن کا حافظہ بلا کا تھا، مشہور سے مشہور اور غیر معروف سے غیر معروف شاعر کے بہترین اشعار ہمیشہ یاد رہتے تھے جن میں نظیر نظم نگار اور انیس مرثیہ نگار کے علاوہ کئی غزل گو بھی تھے۔ ناصر کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ان میں سے ہر شاعر کی خوبیوں اور خامیوں کو جان لیا۔ اتنی گہری نظر کم لوگوں کو ہی ملتی ہے اور ناصر کو انفرادیت دینے اور ناصر کی غزل کو وقار بخشنے میں اس کے اس اندازِ نظر نے بہت حصہ لیا۔ ان شاعروں میں سے جن جن سے ان کے مزاج ملے، جو جو انہیں اپنی سوچوں اور افکار کے ساتھی نظر آئے، ظاہر ہے یہی ان کے دوست بن گئے۔ انیس انہیں صرف اس لئے اچھے نہ لگے کہ شیعہ عقیدہ رکھنے والے ناصر کو مرثیے پڑھتے تھے بلکہ ان کی شاعری کی خوبیاں ناصر کو بھا گئیں۔ ان کے نزدیک انیس جیتی جاگتی تصویریں بناتا ہے:

"میں نے تصویریں دیکھنے سے پہلے How to look at a picture ? کے قسم کے نسخے نہیں پڑھے۔ تصویریں دیکھنا مجھے انیس نے سکھایا۔"

---

[1] ناصر کاظمی: "ادبِ لطیف" اکتوبر ۶۲ء (غالب کا طرفدار نہیں) ص - ۹

مصرعہ: نکلے خیمے سے جو لے کر علی اصغر کو حسین

مرثیہ شروع ہوتے ہی سننے والا کربلا کے میدان میں پہنچ جاتا ہے۔"[1]

اور رہے میرؔ تو میرؔ کو انہوں نے صرف نقش کے لئے نہیں اپنایا بلکہ ان کی اور ناصرؔ کی روحوں میں کہیں نہ کہیں سے مماثلت ضرور تھی۔ مزاجوں میں یکسانی تھی پھر حالات بھی ایک سے ہوتے گئے:

"اب میرؔ کی شاعری میں کس حد تک مجھے اپنی شخصیت کے کچھ اور نئے پہلو بھی نظر آنے لگے یا یوں کہیئے کہ میر صاحب کے کچھ اور رنگوں نے مجھے متوجہ کیا۔۔۔۔ میرؔ کی سیدھی سادی غزلوں اور چھوٹی اور پُر سکون بحروں اور عام لفظوں کی تہ میں مجھے اپنے جذبات کا اضطراب محسوس ہونے لگا۔۔۔۔۔ یہ اتفاق ہے کہ میرؔ صاحب کی شاعری کے بعض اہم عناصر اور ہمارے عہد کے ذہنی اور اجتماعی محرکات میں چند باتیں مشترک نظر آتی ہیں۔۔۔۔۔ میر صاحب کا زمانہ ہمارے زمانے سے مل گیا ہے۔ وہی غریب الوطنی وہی قافلوں کا سفر، وہی رہزنی، آئے دن، حکومت کا بدلنا، خوراک کی قلت، سیلاب کی تباہی اور پرانی اقدار کا بکھر جانا اور رواج ہنر اور وفا پیشگی کا اٹھ جانا، غرض یہ حوادث ہمیں بھی دیکھنے پڑے۔"[2]

اپنی عزیز چیزوں کو چھوڑ کر دوسری جگہ جاتے ہوئے ناصر ان چیزوں کے ماتم میں میرؔ سے قریب آ گئے لیکن انہیں نئی چیزیں بھی عزیز رہیں اس لئے وہ میرؔ سے بالکل الگ راستے پر بھی چلے۔ ویسے میرؔ کو انہوں نے اپنے اندر سمو لیا تھا۔ ان کے قریبی دوستوں کے مطابق ناصرؔ، میرؔ کے کلیات کے ایک ایک ورق کے ایک ایک

---

[1] ناصر کاظمی "نیا دور" شمارہ ۷-۸ (دنیا اسم) ص ۹۹

[2] ناصر کاظمی "سویرا" ۱۹-۲۰-۲۱ (جان پہچان۔ میر تقی میرؔ) ص ۲۶۲ اور ۲۷۰

شعر کی اچھائی اور خوبی سے واقف تھے۔ پھر وہ تہذیب اور وہ روایتیں جو اس وقت بالکل تباہ ہوتی اور مٹتی محسوس ہو رہی تھیں ان کی بازیافت کے لئے ناصرؔ کو میرؔ کے زمانے تک جانا پڑا۔ "بقول ناصر کاظمی" میرؔ کے زمانے کی رات ہمارے زمانے کی رات سے آ ملی" اور شاعر کہ حال و مستقبل میں محصور ہو کر رہ گیا تھا ایک بار پھر "کھوئے ہوئے کی جستجو" کرنے لگا۔[۱] یہ جستجو اس سے پہلے کیوں نہ کی گئی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے تہذیبی سانچے اپنے قدیم کے اثرات اور رنگ بھی ساتھ لیتے آئے۔ لیکن اب سب کچھ چھوڑ کر کچھ نئی چیزوں کی تعمیر کرنا تھی۔ قدیم تہذیبی سانچے اس لئے بہت عزیز ہو گئے تھے کہ نئی جگہ تو شروع شروع میں بالکل بے رنگ و بو معلوم ہوتی جہاں نئی چیزوں کی بنیادیں تک تعمیر کرنے کی بھی ابھی اجازت نہ تھی۔ ناصر کی ابتدائی شاعری کی ہمہ گیر اداسی اس صورتِ حال کا ردِّ عمل ہے، مگر بعد میں ناصرؔ کے اندر جو امید اور توقع اور کہیں کہیں مستقبل کے بارے میں یقین کے چراغ جلنے لگے تو ناصرؔ کی شخصیت بھرپور انداز میں اپنا اظہار کرنے لگی۔ "برگِ نے"، اور "دیوان" کے موضوع اور لہجے میں بھی فرق ہے۔

"اِس سے پہلے یہ بحث آ چکی ہے کہ ۴۷ء کے بعد اُردو غزل کو پھر قبولِ عام حاصل ہوا مگر غزل کی اس نئی تحریک کے سلسلے میں یہ امر لائقِ توجہ ہے کہ اس دور میں غزل کے پُرانے اسالیب کے مطالعہ سے نئی روش ڈھونڈنے کی خاص کوشش ہوئی۔ گویا غزل کی پوری روایت شاعروں کے مدِّ نظر رہی جس کی بنیادوں پر نئی عمارتوں کے منصوبے اٹھائے گئے۔ اس رجحان کی ایک مثال میرؔ کی تقلید یا

---

[۱] فتح محمد ملک: "تعصبات" (غزل اور نئی غزل) ص ۱۵۰

صحیح الفاظ میں میرؔ کا اعتراف ہے۔ اس طرز میں سب سے زیادہ جن شاعروں نے مجاہدہ کیا ان میں ابنِ انشاؔ، ناصر کاظمی اور خلیل اعظمی کو امتیاز حاصل ہوا۔[۱]

"اس دور میں غزل کے کینوس پر ہیئت کے نت نئے تجربے تو نہیں ہوئے مگر اب غزلیں آزادی سے پہلے کی غزلوں سے خاصے مختلف رنگ میں کہی جانے لگیں۔ ہنوز تشکیک اور عدم تحفظ کی فضا موجود تھی جس سے غزل میں خارجی رجحانات بڑی تیزی سے داخل ہوئے۔ تاہم کچھ غزل گو میرؔ کے سے دھیمے انداز میں دل کی باتیں بھی کہہ رہے تھے۔ میرے نزدیک یہ لوگ فراقؔ اور حسرتؔ سے بھی خاصے متاثر تھے......... ناصرؔ کاظمی اور ابنِ انشاؔ نے تو میرؔ کی بحریں اور اسلوب بھی اختیار کیا اور کسی حد تک اس میں کامیاب بھی ہوئے مگر میرؔ کے سے سوز و گداز اور ذاتی تجربوں کی کمی نے ان کے ہاں وہ تاثر بھرپور انداز میں نہیں ابھرنے دیا جو میرؔ کا حصہ ہے"۔[۲] یہاں آخری فقرے میں مجھے سلطان رشک سے یہ اختلاف ہے کہ ہر شاعر کا اپنا سوز و گداز ہوتا ہے اور ہر انسان کے اپنے ذاتی تجربے ہوتے ہیں بلکہ ایک ہی تجربہ کئی مختلف لوگوں میں مختلف انفرادی تجربوں کی صورت میں ڈھل جاتا ہے، خود میرؔ کے زمانے میں دردؔ کے ذاتی تجربے کا شعور میرؔ سے مختلف ہے۔ تو پھر اتنی دور آکر ناصرؔ جیسا شاعر کیسے میرؔ کے تجربوں پر ہی انحصار کرتا اور خود تجربے کے دکھ اور صبر آزما لمحے برداشت کرنے کی قوت نہ پیدا کرتا۔ اگر ایک طرف سلطان رشک یہ کہتے ہیں تو دوسری طرف جابر علی سید کا کہنا ہے کہ "ناصرؔ کی مادگی"

۱۔ ڈاکٹر سید عبداللہ "خیابان" خاص نمبر ۱۹۶۴ء (پاکستانی ادب کے دس سال)

۲۔ سلطان رشک "نیرنگِ خیال" جدید غزل نمبر ۱۹۶۹ء (اردو غزل پاکستان میں)

میرؔ کی یاد دلاتی ہے لیکن اس میں زیادہ شعریت اور رعنائی ہے:

رین اندھیری ہے اور کنارہ دور چاند نکلے تو پار اُتر جائیں
شام سے سوچ رہا ہوں ناصرؔ چاند کس شہر میں اُترا ہوگا

جنگل میں ہوئی ہے شام ہم کو بستی سے چلے تھے منہ اندھیرے
دیتے ہیں سراغ فصلِ گُل کا شاخوں پہ جلے ہوئے بسیرے
رودادِ سفر نہ چھیڑ ناصرؔ پھر اشک نہ تھم سکیں گے میرے[1]

"بعد کے شعرا میں ناصرؔ کاظمی، ابنِ انشاؔ اور خلیل الرحمان اعظمی غزل کے سب سے زیادہ نمایاں شاعروں میں سے ہیں۔ ناصرؔ کاظمی کی غزل میں اپج اور فکر و بیان کی ندرت ہے۔ وہ زندگی کی بڑی بڑی حقیقتوں کے ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کو بھی فراموش نہیں کرتے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ تینوں شاعر میرؔ سے بہت زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ اس سے ان کی غزل کو جہاں فائدہ پہنچا ہے وہیں یہ بھی ہوا ہے کہ کبھی کبھی میرؔ کی دلیوقامت شخصیت اور انفرادیت کے نیچے ان کی اپنی انفرادیت بُری طرح دب گئی ہے۔ ناصرؔ کاظمی نے ایک حد تک اپنے کو اس ہلاکت سے بچانے کی زیادہ کوشش کی ہے"۔[2]

"میں بھی میرؔ صاحب کا رسیا ہوں لیکن میرؔ پرست نہیں۔ میں نے اگر میرؔ

---

[1] جابر علی سید۔ "فنون" جدید غزل ۶۹ء (جدید نظم، جدید غزل اور جدید طرزِ احساس)

[2] خلیق ابراہیم۔ "اردو غزل کے پچیس سال"، ص

صاحب کو مانا ہے تو ٹیٹے جھگڑے اور فساد کے بعد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرا اپنا جیون ساتھی ہے۔ لیکن ایسا ساتھی جس سے ہر قدم پر جھگڑا رہتا ہے۔ مدّت سے ہم ایک گھر میں رہتے ہیں، ہنستے بولتے ہیں اور روٹھتے منتے رہتے ہیں۔[۱]" شکیل الرحمٰن اپنے ایک مضمون "جدید شاعری کے نئے چراغ" میں لکھتے ہیں کہ "ناصر کاظمی میریت سے اتنے قریب ہیں کہ ان کی غزلوں میں بہت حد تک وہی آہنگ اور وہی پُرسوز کیفیت (Mood) پیدا ہو گئی ہے جو میر کی بڑی خصوصیتیں ہیں۔ ناصر میر کے فن کی نزاکتوں کو قبول کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان کی شخصیت ایک فرار حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن یہ فراریت "نرگسیت" سے دور رہے ہے۔[۲]"

میری رائے میں ناصر کو صرف میر کے پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کرنا ناصر کی انفرادیت کے ساتھ کھلی زیادتی ہے۔ ناصر یقیناً میر سے متاثر ہیں مگر وہ غالب اور اقبال اور فراق سے بھی متاثر ہیں، اور متاثر صرف اس حد تک ہیں کہ چراغوں میں سے چراغ جلتے ہیں۔ ان اساتذہ کے فن کو انہوں نے اپنے اندر یوں رچا بسا لیا ہے کہ جب وہ بولتے ہیں تو اُردو غزل کا پورا ماضی جگمگا اٹھتا ہے اور اس جگمگاہٹ میں ناصر کی فنی شخصیت ایک آفتاب کی طرح اُبھری رہتی ہے۔

غزل کے احیا اور اس کی حیاتِ نو کا احساس تبھی ہوگا جب غزل میں تازگی محسوس ہوگی۔ نئے ردیفے، نئی سوچیں اور نئے سانچے سامنے آئیں گے۔ اور ناصر کی غزل نے یہ احساس عام کیا ہے۔ "یہ کتاب دبرگِ نے، شعر کی نئی کتاب ہے اور ایک نئے احساس کی حامل ہے جو اسے پچھلی نسل کی شاعری سے الگ کرتی ہے۔

۱۔ ناصر کاظمی "سویرا" ۱۹-۲۰-۲۱۔ (جان پہچان میر تقی میر) ص ۲۶۱

۲۔ شکیل الرحمٰن "شاہراہ" دسمبر ۵۹ء (جدید شاعری کے نئے چراغ)

ناصر کاظمی کی غزلوں کا مجموعہ "برگِ نے" اس لحاظ سے قابلِ توجہ ہے ایک مدت کے بعد شعر کی ایک کتاب ہمارے سامنے آئی ہے جو پڑھنے پر یہ احساس پیدا کرتی ہے کہ یہ آواز قدرے الگ ہے [1] اور اس کے باوجود الگ ہے کہ اس میں روائتوں سے بچ بچ کر چلنے کی کوشش نہیں کی گئی۔

"عین اس دور میں جب صنفِ غزل اپنی بعض پابندیوں اور حد بندیوں کے باعث دوسری اصنافِ سخن کے مقابلے میں دبنے لگی تھی، ناصر غزل ہی کا علم بلند کر کے اٹھا اور اپنی جیتی جاگتی شاعری سے غزل کے وقار کو بحال کیا ہے [2]" ناصر سے جب پوچھا گیا کہ "تمہارے زمانے میں غزل معیوب و معتوب صنفِ سخن تھی۔ اس فضا میں تم غزل کی روش پر کیوں چلے، کیسے چلے؟" تو ناصر نے کہا تھا: اصل میں غزل کی روش پر تو میں نہیں چل نکلا۔ مجھے غزل، قطعہ، رباعی آزاد نظم وغیرہ سے کوئی سروکار نہیں رہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ غزل تو اتفاقیہ ایک صنف مجھے پسند تھی، چونکہ میرا ایک پس منظر تھا اس میں، مَیں نے زیادہ تر غزل کی شاعری پڑھی، پھر یوں دیکھیے کہ اردو کا بہترین سرمایہ تو غزل میں ہی ہے۔ تو جس زمانے میں مَیں نے شعر کہنا شروع کیے، اسلامیہ کالج لاہور میں مَیں تھا۔ یہاں فیض احمد فیض، راشد اور میرا جی کا طوطی بول رہا تھا اور اس کے بعد دوسری نسل تھی۔ یوسف ظفر اور ان کے ساتھی۔ غزل واقعی مشاعرے میں پڑھنا بہت مشکل تھا۔ لیکن یہ ہے کہ میں ترنم سے پڑھا کرتا تھا۔ میرے ساتھ حمید نسیم، حفیظ ہوشیارپوری تھے۔ ان کو بھی بڑے ادب سے سنا جاتا تھا۔ تو ان دو تین شاعروں کے علاوہ غزل کا چراغ ویسے بھی نہیں جلتا تھا۔ لیکن دراصل میں نے غور کیا کہ غزل کے خلاف لوگ

---

[1] انتظار حسین

[2] احمد ندیم قاسمی "فنون" "حرفِ اوّل"

نہیں تھے، بلکہ غزل میں Cliche کی پرانی ڈگر جو تھی اُس کے خلاف تھے۔ وہ کہتے تھے کہ میاں نئی بات کرو۔ تو اگر غزل میں نئی بات کہی جا سکے اور غزل کا احوال، تمہیں پتا ہے کہ دلّی شہر کا سا ہے۔ یہ بار بار اُجڑتی ہے اور بار بار بستی ہے۔ کئی بار غزل اُجڑی لیکن کئی بار یہ زندہ ہوئی اور اس کا یہی امتیاز ہے کہ غزل میں شاعری اچھی ہوئی ہے۔ شاید نظم کا اس آسانی سے چراغ نہیں جلا۔ خود فیض نظم لکھتے ہیں لیکن غور سے دیکھیے ان کی ساری کی ساری شاعری غزل ہے۔ تغزل ہی تغزل تو ہے جس کی وجہ سے فیض شاعر ہے۔ تو یہ ہے۔ غزل اس لیے میں نے اختیار کی اور جہاں تک جدید شاعری کا تعلق ہے اس میں — کچھ خیالات اُس زمانے میں نئے آئے تھے تو ان کا غزل برابر ساتھ دیتی رہی ہے۔ اور میرا خیال ہے جو غزلیں میں نے کہی ہیں میں تو نہیں کہہ سکتا لیکن میں نے اپنی دانست میں یہ سوچ کر کہیں کہ وہ زمانے کے تقاضوں کو پورا کریں اور اس میں میرے عصر کی روح ہو۔

ناصر کی غزل میں ایک اور نئی بات یہ ہوئی کہ انھوں نے دو مختلف اندازِ فکر کو گھلا ملا کر اپنی ایک تعمیری سوچ میں ڈھال لیا۔ ناصر کا ایک تو رومانوی اندازِ فکر ہے جس کی وجہ سے وہ فطرت سے بہت لگاؤ رکھتے ہیں۔ یوں تو ہر شاعر فطرت کے مناظر سے اپنی شاعری کو حُسن دیتا رہتا ہے لیکن اپنے اردگرد پھیلے پیش منظر سے پرے پس منظر میں دھندلے دھندلے نیلے نیلے مناظر کو ہی دیکھے چلے جانا رومانی لوگوں کا کام ہے۔ وہ جب اپنے آپ کو حالات سے مطابق نہیں پاتے تو ان سے فرار حاصل کرنے کی کوشش میں مناظر و مظاہر فطرت سے دوستی کر لیتے ہیں اور اس دوستی کے نشان ناصر کے ہاں بھی ہیں، خصوصاً "برگِ نے" میں:

"ناصر کاظمی کی شعری سلطنت مختلف منطقوں میں بٹی ہوئی ہے۔ تنہائی، اداسی، فراق، یادیں، قدری زندگی کا تغیر، بچھڑنے والوں کی تلاش، ان دیکھے کی جستجو، پرانی

۱؎ ناصر کاظمی ٹی وی انٹرویو

اور خرابے اس سلطنت کے مختلف منطقے ہیں۔ اس کی اس سلطنت کا نقشہ سہمے ہوئے شہروں، ٹھٹھری ہوئی راتوں، سونے راستوں، دہکتے کنکروں اور کانٹوں، بے چراغ گلیوں، جلی ہوئی کھیتیوں، پیاسی جھیلوں، بجھے دلوں کے ڈھیروں، خاموشیوں کے قفل، دھوپ کے سائبان، زخمِ وفا، آتشِ خاموشی سے مرتب ہوتا ہے۔ ناصر نے اپنی سلطنت میں بعض سیرگاہیں بھی بنائی ہیں۔ جہاں انسانوں اور فطرت کا حسن اور معصومیت، منہ اندھیرے چڑیوں کی چہچہاہٹ، چاند، ستارے، شبنم، خوبصورت آنکھیں، پھول اور پھولوں جیسے انسان نظر آتے ہیں۔"[1]

اس سلطنت کے بیشتر منطقے رومانویت کی دھیمی دھیمی، اداس اداس، مٹی مٹی سی فضا میں ہیں۔ نرم نرم آوازیں ہیں اور حسن ہی حسن ہے۔ یہ ایسی فضا ہے جہاں صرف سوچنے کو جی چاہتا ہے۔ اٹھ کر چل پڑنے یا کوئی کام کرنے یا مزید حسن ہی تعمیر کرنے کی تحریک نہیں ہوتی۔ لیکن ناصر کے ہاں تو بد صورتیوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں ظالم باغبان سے حسین پھولوں کو محفوظ رکھنے کی خواہش کا بھی اظہار کیا گیا ہے اور یہ اندازِ فکر مختلف ہے۔ بے شک بغاوت بھی اس اندازِ فکر کی ایک خصوصیت ہے۔ لیکن ناصر تو روایت کا احترام بھی کرتے ہیں۔ اور پھر صرف بغاوت ہی نہیں کرتے انقلاب چاہتے ہیں۔ تعمیری تبدیلیوں کے خواہش مند ہیں۔ اب ان کی سلطنت (دیوان) میں میلی چادر اوڑھنے والے بھی دکھائی دے جاتے ہیں۔ یہاں پر حسن و اچھائی کو چرانے کے لئے:

ع ہیں گھات میں ابھی کچھ قافلے لٹیروں کے

اس لیے یہ مشورہ بھی دیئے جاتے ہیں کہ:

ع ابھی جمائے رہو مورچے کنارے پر

وہ "ہوائے ظلم" کی ہی شناخت نہیں کرتے بلکہ اس سے زمین کے پانی

---

[1] سجاد باقر رضوی۔ 'لفظ'، جنوری ۱۹۷۴ء (پگلے کی پیغمبری) ص۔ ۱۹

اور سورج کی کرن کو محفوظ رکھنے کے لیے خبردار بھی کرتے ہیں۔ اس طرح دو مختلف اندازِ فکر ناصر میں اکٹھے ہو گئے اور اس سنگم اور ملاپ نے ناصر کی غزل کو نہ صرف انفرادیت دی، بلکہ ناصر نے اس سے مسیحائی کے معجزے جیسا کام لیا اور اس وقت جب غزل انتہائی بلندیوں سے بے نیازی اور لاپرواہی کی ٹھوکریں کھا کر تقریباً لڑھکتی ہوئی نیچے گمنامیوں کی طرف آ رہی تھی تو ناصر کی غزل نے اس صنفِ سخن کا مضبوط سہارا بن کر اس کے زوال کو روکا اور پھر سے ایک بلند چوٹی پر اس کا پرچم لہرا دیا اور ظاہر ہے یہ چوٹی سر کرنے میں غزل کا بھرپور ساتھ اس وقت صرف ناصر نے دیا اور غزل کی گم ہوتی ہوتی سانسیں پھر بحال ہو گئیں اور پھر ناصر کی غزل نے اپنا سفر جاری رکھا اور سوچوں کی حسین "رات" کے ساتھ حالات کی دھوپ چھاؤں کو بھی برداشت کیا۔ جب صدمے ملے تو کہا:

کچھ تو نازک مزاج ہیں ہم بھی اور یہ چوٹ بھی نئی ہے ابھی

پھر اچانک ان کے بہتے ہوئے آنسو تھم گئے، اس لیے کہ انہیں احساس ہوا کہ ان کی ذات سے باہر بھی کچھ غلط صورتِ حال بننے والی ہے:

طنابِ خیمۂ گل تھام ناصرؔ کوئی آندھی افق سے آ رہی ہے

اور طوفان کو تو آنا تھا سو آیا۔ شاعر اُسے کہاں تک روکے رکھتا لیکن شاعر کے ارادوں نے طوفان کو شکست بھی تو دی اور وہ پلٹ گیا تب:

بچھڑ گئے تھے جو طوفان کی رات میں ناصرؔ
سنا ہے اُن میں سے کچھ آ ملے کنارے پر

یوں وہ مقام بھی آیا جہاں:

آئینہ لے کے پھر صبا آئی بجھتی آنکھوں میں ضیا بھر آئی

یہ درست ہے کہ ناصرؔ کی غزل اردو غزل کی روایت کو اپناتی ہے اور وہ غزل کے

شروع کے زمانے میں اس کے تغزل کے جو خواص متعین کئے گئے تھے ان سب کو بھلا نہیں دیتی لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں لینا چاہیے کہ یہ غزل صرف پرانے زمانوں میں اتر گئی ہے۔ نہیں ایسا نہیں ہے۔ ناصر تو کہتا ہے "میں جب تازہ غزل کہتا ہوں تو پھر میرؔ کو بھی سناتا ہوں اور احمد مشتاق کو بھی"۔[۱] اس کا مطلب تو واضح ہے ہی کہ ناصرؔ میرؔ کو پہچانتے ہیں اور پھر اپنی پہچان اپنے ہم عصر سے کراتے ہیں۔ یوں میرؔ کا زمانہ ناصرؔ اور احمد مشتاق کے زمانے سے آملتا ہے۔ ناصر نے اس کا ذکر تو نہیں کیا کہ ان کا زمانہ مستقبل کے کسی شاعر کے زمانے سے جا ملے گا، لیکن اس مصرع کا مطلب تو یہی نکلتا ہے

ع ہر دور کی غزل میں میرا نشاں ملے گا

غزل کا سانچہ اور بہت حسین سانچہ تو مدتوں پہلے سے بنا چلا آ رہا ہے۔ یوں غزل کی ہیئت میں اس طرح کا اضافہ تو ممکن نہیں جس طرح نظم میں کہ کئی ہیئتیں بنی ہیں اور بنیں گی۔ لیکن غزل میں شاعر کی انفرادیت اور اس کے فن کا کمال اس کے اسلوب سے ظاہر ہوتا ہے اور یہی اس شاعر کی غزل کی ہیئت کھُرتی ہے۔ ناصر کی غزل کی جن خصوصیات نے اہلِ ادب کو سب سے پہلے چونکا کے رکھ دیا ان میں ان کا اسلوب بھی شامل تھا۔" ناصر کی لے، اس کی اشاریت، ایمائیت، رمزیت اس کے الفاظ کا صوتی آہنگ، اس کی زبان کی روانی کا ترنم اس کے منتشر اشعار کا تسلسل اور ان سب کے امتزاج سے پیدا ہونے والی ایک مجموعی فضا ناصر کی غزلوں میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ اس فضا نے اس کی ہیئت کو جدت سے ہم کنار کیا ہے۔ ناصر کی غزلوں میں یہ تجربات اردو غزل کی ہیئت

---

[۱] ناصر کاظمی، "ادبِ لطیف" نومبر ۶۲ء (میرا ہمعصر) ص،

میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔"

تو یوں اسلوب اور مواد کے لحاظ سے ناصر کی غزل نے اردو غزل کو حیاتِ نو دے دی ؛" ناصر کاظمی کی شعری حیثیت کے تعین میں دو باتیں اہم ہیں۔ اول یہ کہ انھوں نے تاریخی اعتبار سے غزل کا پرچم اس وقت بلند کیا جب کہ سارے برِ صغیر میں اردو شاعری کا سب سے بڑا اظہار نظموں میں ہو رہا تھا۔ دوسرے یہ کہ پاکستان کی اردو شاعری میں ناصر کاظمی کا نام فیض احمد فیضؔ اور احمد ندیم قاسمی کے نام کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ ...... فیض اور ندیم کی طرح انھوں نے بھی ایک مدت تک اردو غزل کے پیشِ منظر پر قبضہ جمائے رکھا اور ملک کے گوشے گوشے میں ایسی غزلیں کہی جاتی رہیں جن میں ناصر کاظمی کی جھلک صاف نظر آتی تھی۔ اپنی رومانی طبیعت پر غزل جیسی کلاسیکی فارم کی تنظیم عائد کر کے ناصر نے ایسی مرصع اور اثر انگیز غزلیں کہی ہیں جن میں جذبہ کی آنچ اور فن کی پختگی دونوں کا بھرپور احساس ملتا ہے۔"[۲]

ناصر کی غزل نے صرف ایک خاص وقت میں ہی اردو غزل کو اپنے شعروں کی دولت نہ دی بلکہ ان کی زندگی کی آخری سانس تک یہ کان سونا دیتی رہی۔ اس تخلیقی فنکار کی تخلیقی قوتیں ہمیشہ جاگتی رہیں۔ پھر یہ بھی ہوا کہ وہ زندہ تو رہے مگر حرکت و تلاطم سے بیگانہ رہے نہیں، ان میں جمود نہیں آیا بلکہ ان کے خیالات میں اور پھر اسی طرح ان کی غزل میں ارتقائی سفر جاری رہا۔ آخری دور میں تو ان کی غزل اور ان کی سوچ میں بہت وسعت آ گئی تھی اور ناصر کو صرف فطرت سے ہی پیار نہ رہا تھا بلکہ انہیں متحرک زندگی سے بھی محبت ہو گئی تھی۔ وہ ناصر جو کبھی کہتے تھے کہ" بانسری کو

۱ؔ ڈاکٹر عبادت بریلوی "غزل اور مطالعہ غزل" (اردو غزل میں ہیئت کے تجربے) ص ۶۱۲-۶۱۳

۲ؔ سجاد باقر رضوی "فنون" جون ۷۲، (ناصر کاظمی۔ ایک جائزہ) ص ۴۰۔

کس آئیڈیالوجی نے جنم دیا تھا[1]" وہی اب فن کے بارے میں یہ صحت مند سوچ رکھتے ہیں کہ "شاعری تو ایک نقطۂ نظر ہے زندگی کو دیکھنے کا، .... چیزوں کو دیکھنے کا۔ ان کو ایک خاص موزوں طریقے سے بیان کرنے کا نام شاعری ہے۔ .... اور یہ کہ Commitment میں نے اس طرح بعض بیانات کی صورت میں تو شاید بہت کم کیا ہو لیکن میرے کلام میں آپ کو ــــ میرا خیال ہے کہ میں نے جو لفظ لکھا ہے Commitment سمجھ کر لکھا ہے، پاکستان کی پچیس سالہ تاریخ کو آپ دیکھیں اور آپ میرے کلام کو دیکھیں تو ضرور اس میں وہ چیزیں دھڑکتی ہوئی نظر آئیں گی"[2]

---

[1] ناصر کاظمی "نیا دور" شمارہ ۷، ۸ دنیا اسم اص ۹۲۔

[2] ناصر کاظمی۔ ٹی وی انٹرویو

چوتھا باب

ناصر کی غزل کے اہم پہلو

کہتے ہیں غزل قافیہ پیمائی ہے ناصر
یہ قافیہ پیمائی ذرا کر کے تو دیکھو

تیسرے باب میں اردو غزل کے احیاء میں ناصر کی غزل کے مثبت کردار کو بیان کیا گیا تھا اور ناصر کی خوبیوں پر ایک نظر ڈالی گئی تھی۔ اب اس باب میں ہم ناصر کی غزل کے فکری و فنی پہلوؤں کو جانچیں گے۔ اس کے لیے سب سے پہلے یہ دیکھ لینا مناسب ہوگا کہ غزل کیا ہے اور اس کا فن کیا ہے؟ اس سلسلے میں شاعروں اور نقادوں کی آراء دیکھ لیتے ہیں۔

حقیقی معنوں میں غزل کی شاعری وہ ہے جس سے ہمیں درد بھری اور آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دے...... ہم درد بھری باتیں کیوں سننا چاہتے ہیں، ہم درد بھرے اشعار کو کیوں پیار کرتے ہیں، اس لیے کہ اگر درد سچا اور پکا ہے اور اس میں خلوص ہے، معصومیت ہے، نرمی ہے اور ترنم ہے تو ایسا درد ہماری ڈھارس بندھاتا ہے۔ گہرے سے گہرا اطمینان اور توانائی بخشتا ہے اور حیات اور کائنات کے لیے ہمارے اندر محبت کے جذبات پیدا کر دیتا ہے...... غزل زمان و مکان میں بکھرے ہوئے اور پھیلے ہوئے واقعات کا ست یا جوہر نکال لیتی ہے اور ہر شخص کی آپ بیتی کو جگ بیتی

بنا دیتی ہے"۔[1]

"...... غزل کا بنیادی یا لغوی مفہوم جو بھی ہو ایک صنفِ شاعری کی حیثیت سے مضامین اور اسالیب دونوں میں اس سے زیادہ وسعت اور تنوع کا امکان کسی دوسری صنف میں نہیں"۔[2]

"...... اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غزل میں اگرچہ تنوع اور ہمہ گیری ہے لیکن اس کے باوجود ایک یکسانی اور یک رنگی بھی ہے۔ یہ صورتِ حال سوائے غزل کی صنف کے کسی دوسری صنفِ سخن میں نہیں مل سکتی اور اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ غزل کا دائرہ محدود ہے: اس میں وضاحت اور تفصیل تحلیل اور تجزیے کی گنجائش نہیں۔ اس میں بہت کم کہہ کر بہت کچھ مراد لی جاتی ہے۔ اس میں کسی چیز کو کھول کر بیان نہیں کیا جاتا۔ اس میں جو الفاظ اور اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں ان کی معنویت صرف اصلیت اور حقیقت تک محدود نہیں رہتی۔ ان کا ایک مجازی مطلب بھی ہوتا ہے۔ ان میں ایک چھپی ہوئی معنویت بھی ہوتی ہے۔ غزل میں توضیح و تشریح کی بجائے اشاروں اور کنایوں سے کام لیا جاتا ہے"۔[3]

"..... وہ کون سی نئی ضروریات تھیں، جن کے پیشِ نظر صنفِ غزل ایجاد کرنا پڑی؟ وہ ضروریات عورتوں کے حسن کی بجائے زندگی کی ترجمانی و تنقید سے متعلق تھیں...... اردو غزل کی ابتداء اور بے مثال ترقی بھی اسی عہد (اورنگ زیب سے غالب تک کے زمانے) میں ہوئی۔ اس ڈیڑھ صدی کے دوران جن ہستیوں نے

1۔ فراق گورکھپوری "نگار" شمارہ ۴-۰، (غزل کیا ہے؟) ص ۱۳۰

2۔ مجنوں گورکھپوری "اصنافِ شاعری نمبر سالنامہ ۶۷ء (شعر اور غزل) ص ۳۰۔

3۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی "غزل اور مطالعۂ غزل" (غزل اور تغزل) ص ۱۲۹۔

غزل کو غزل بنایا وہ تصوف و حکمت اور جرأت و بے باکی میں اپنی مثال آپ تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل محض عورتوں کے حسن کی بات نہیں بلکہ بادہ و ساغر کے پیرائے میں مشاہدۂ حق کی گفتگو ہے۔" لہ

غزل پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس کے حق میں بھی اور مخالفت میں بھی۔ کلیم الدین احمد کی ترش اور تلخ رائے سے پہلے مولانا الطاف حسین حالی نے بھی کچھ اعتراضات کئے تھے۔ حالی کو شکوہ اس بات پر تھا کہ بیشتر شاعر غزل میں ذاتی تجربے کا بیان نہیں کرتے۔ بلکہ ردیف اور قافیے کے سہارے شعر موزوں کر دیتے ہیں۔ اس لیے حالی نے کہا " ہمارے ہاں قافیے کے پیچھے ایک ردیف کا دُم چھلا لگا لیا گیا ہے۔ اگرچہ ردیف ایسی ضروری نہیں سمجھی جاتی ہے جیسا قافیہ سمجھا جاتا ہے، لیکن غزل میں اور خاص کر اردو غزل میں تو اس کو وہی رتبہ دیا گیا ہے جو قافیے کو...... پس جب کہ ردیف اور قافیے کی گھاٹی خود دشوار گزار ہو تو اس کو اور زیادہ کٹھن اور ناقابلِ گزر بنانا انہیں لوگوں کا کام ہو سکتا ہے جو معنی سے کچھ سروکار نہیں رکھتے اور شاعروں کا مال محض قافیہ پیمائی سمجھتے ہیں اور بس"۔ ٹہ

ناصر کاظمی بھی انہی لوگوں، یعنی غزل کو قافیہ پیمائی سمجھنے والے لوگوں کے مخالف ہیں۔ انہوں نے محض قافیہ پیمائی نہیں کی بلکہ بہت اچھی غزل کہی۔ ان کے دوست شیخ صلاح الدین کا کہنا ہے کہ ناصر کی غزل یوں ہے جیسے پہاڑ کی بلند ترین چوٹی پر ہر طرف بادل گھرے ہوئے ہوں، بجلی چمک رہی ہو، یوں وقفے وقفے کے بعد کہیں کہیں سے کوئی منظر دکھائی دے جاتا ہے۔ غزل گو شعور د

لہ الطاف حسین حالی " مقدمہ شعر و شاعری " ص ۱۸۵

دانش کی بلندیوں سے انسان کی اس طوفان زدہ زندگی کے دکھ سکھ کے مختلف پہلو دیکھتا ہے اور غزل میں اس کا اظہار کر دیتا ہے۔ یوں منظر مختلف، واقعات مختلف، لیکن ایک تسلسل ضرور قائم رہتا ہے۔ ان مناظر کو مربوط کرنا تخیل کا کام ہے۔ اصل میں غزل گوئی کرنا ہو تو ایک خاص بلندی پر کھڑا ہونا ہی پڑتا ہے تاکہ دور تک اور گہرائی تک دیکھا جا سکے۔ شیخ صلاح الدین صاحب کا مزید ارشاد ہے کہ میں ناصر سے کہتا تھا کہ تجھے پڑھنا تو مصیبت ہے! اس لیے کہ ناصر کی ایک غزل پڑھتا ہوں تو اور کچھ نہیں پڑھتا۔ سب سے اہم بات جو گفتگو کے دوران میں شیخ صاحب نے بتائی وہ یہ ہے کہ ناصر شاعری میں الہام کے قائل نہیں تھے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ صرف حصولِ علم سے شاعر بنا جا سکتا ہے۔ محض علم حاصل کر لینے سے اگر کوئی شخص فن کار بن سکتا تو بھلے مانس تنقید نگاروں کو کون پوچھتا؟ فن کار اپنے علم کو براہِ راست نہیں اگلتا بلکہ اسے ہضم کرتا ہے اور تخلیقی لمحوں کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ علم حاصل کرنے اور تخلیقی کام کرنے کے درمیان ایک وقفہ بھی ہوتا ہے۔

علم اور تجربے کے سفر کے بعد ذہن تھک جاتا ہے۔ اس تھکن میں سرور کے ساتھ ساتھ ایک بے زاری کی کیفیت بھی ہوتی ہے۔ اس وقفے میں فن کار اپنے علم اور تجربے کو اپنے تصور کی کٹھالی میں پگھلا کر کندن سونا بناتا ہے۔

شیخ صاحب نے یہ بھی بتایا کہ ناصر الفاظ چن کر اور شعر منتخب کر کے غزل کہتے۔ جب تک اچھی طرح تسلی نہ ہو جاتی شعر نہ کہتے۔ پورا اطمینان ہو جاتا تو پھر شاعری کرتے اور اس کے بعد بھی کاٹ چھانٹ کرتے رہتے تھے۔ مسلسل غور کیے جانا ان کا معمول تھا اور خاص اہتمام کرنا ان کی عادت تھی۔ چاہے شعر ہو، کھانے کی بات ہو، لباس کا معاملہ ہو، لوگوں سے ملاقات کرنا ہو، رات جاگنا ہو یا شعر کہنے ہوں، وہ یہ سب

کچھ خاص اہتمام سے کرتے تھے۔

ناصر کی داخلی غزل کی صحیح پہچان کے لیے ہمیں ناصر کی غزل کے اہم فکری اور فنی پہلوؤں پر غور کرنا ہوگا۔

اچھے غزل گو کا واضح نظریۂ حیات نہ ہو تو وہ غزل گو ہی نہیں کیونکہ نظریۂ حیات ہوگا تو تبھی کوئی وزنی بات کی جا سکتی ہے۔ ناصر چاہتے ہیں کہ یہ جو انسانی زندگی ہے اس کے سبھی دُکھ ختم ہو جائیں۔ جب شاعر اپنے دُکھوں کا اظہار اس طرح کرے کہ سامع اور قاری کے دل میں بھی ٹیس اٹھے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اصل میں یہ احساس دِلا رہا ہے کہ دیکھو میں کتنا دکھی ہوں یا یہ کہ ہم سب کتنے دُکھی ہیں۔ پھر چاہے وہ یہ کہے یا نہ کہے کہ ان دکھوں کو کس طرح اور کیونکر دور کیا جا سکتا ہے، وہ چاہتا تو یہی ہے کہ اِس دنیا میں سُکھ ہی سکھ پھیل جائیں۔ انسان کی سبھی نیک خواہشیں پوری ہوں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو ناصر یہ کیوں کہتے ''.....

دنیا کتنی نئی ہے مگر پھر مجھے یہ اتنی پرانی کیوں نظر آتی ہے؟ کون سی شے گم ہو گئی ہے کہ ہم نے نئی دنیا بنا کر بھی دیکھ لی اور وہ فوراً کے فوراً پرانی نظر آنے لگی؟

حال کا حال بے حال ہے نئے ساز و سامان بہت ہیں مگر ان میں کوئی ترتیب نظر نہیں آتی۔ سب کچھ اُلٹ پلٹ ہے۔ کہیں ساز و سامان ہی ساز و سامان ہے، کہیں بالکل بے سرو سامانی ہے''۔ [1]

اور پھر وہ یہ مشورہ کیوں دیتا ہے:

سازِ ہستی کی صدا غور سے سُن کیوں ہے یہ شور بپا غور سے سُن
یاس کی چھاؤں میں سونے والے جاگ اور شورِ درا غور سے سُن

---

[1] ناصر کاظمی ''لفظ'' دسمبر ۱۹۷۲ء (خطبۂ صدارت) ص ۱۳۸۔

تیری فریاد گونجے گی دھرتی سے آکاش تک
کوئی دن اور سہہ لے ستم صبر کر صبر کر

ڈاکٹر محمد حسن اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں "...... ناصر کی غزلوں کی خصوصیت تنہائی اور خود فراموشی کے احساس ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ خود فراموشی محض نجی اور ذاتی نہیں ہے بلکہ اس احساس نے قدرتی مناظر، آسمان کے چاند، زمین کے اونچے اونچے پیڑوں اور آباد شہروں کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ یہ عالمِ تنہائی، درد کی ایک باریک سی چھوٹ اور ملگجی چاندنی، یہی ناصر کی دنیا ہے۔ ناصر اپنی دنیا کا قیدی نہیں۔ اس کا فرمانروا مغنی ہے۔ مگر ایک ایسا فرمانروا جو مطلق العنان ہے نہ مکمل طور پر خود مختار، بلکہ اس کی آواز اس کی دنیا کی ایک ایک پتی، ایک ایک پھول سے چھن کر آتی ہے۔ اس کی آرزوئیں بڑی چھوٹی سی ہیں۔ دوستوں کی محفلیں، قہقہے، دیارِ رنگ و بو میں راتیں، ہم سفروں کے ساتھ وقت گزارنے کا ارمان، خلوص اور پیار کے دو بول —— مگر غور کیجئے تو اجتماعی زندگی کو سنوارنے کے منصوبے، انسان کو چاند تک لے جانے اور ستاروں پر کمند ڈالنے کے حوصلے سبھی انہی چند چھوٹے چھوٹے خوابوں کی تعبیریں ہیں کہ انسان ہر ملک، ہر زمانے کا انسان، خوش رہنا چاہتا ہے، ہنسنا کھیلنا چاہتا ہے"۔ [۱]

ناصر بہت سی خواہشیں دل میں ہیں بے قرار
لیکن کہاں سے لاؤں وہ بے فکر زندگی

آخر ناصر یہ کیوں بتا رہا ہے کہ اُسے بے فکر زندگی میسر نہیں۔ اس لیے ناکہ وہ ایسی زندگی کا خواہشمند ہے جو اُسے میسر نہیں۔ آخر ایسا کیوں ہے کہ:

---

[۱] ڈاکٹر محمد حسن "نقوش" جون ۶۰، (آج کی شاعری)

مٹی مٹی سی امیدیں تھکے تھکے سے خیال بجھے بجھے سے نگاہوں میں غم کے افسانے

ہم سے پوچھے کوئی افسانۂ گل ہم پہ گزرے ہیں خزاں کے صدمے

وہ درحقیقت انسانی زندگی کے تنوع کے شاعر ہیں اور انہوں نے زندگی کے تنوع پہلوؤں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ زمانے کے حالات، گرد و پیش کے واقعات اور عصری میلانات کی ترجمانی اور عکاسی تو اُن کی غزل کا ایک پہلو ہے۔ اس کے علاوہ زندگی کے دوسرے ان گنت پہلوؤں کو بھی انہوں نے غزل میں داخل کیا ہے۔ مثلاً ناسازگار سماجی ماحول اور ایک غلط نظامِ اقدار میں زندگی جن حالات سے دوچار ہوتی ہے اس کی تفصیل بھی انہوں نے اپنی غزلوں میں پیش کی ہے۔ اس نظام نے زندگی کو اُجاڑ کر رکھ دیا ہے جس کی وجہ سے ان کی نظریں گھر گھر سوگ کو پھیلا ہُوا دیکھ رہی ہیں.....

گلی گلی آباد تھی جن سے کہاں گئے وہ لوگ
دلّی اب کے ایسی اُجڑی گھر گھر پھیلا سوگ
سارا سارا دن گلیوں میں پھرتے ہیں بے کار
راتوں اُٹھ اُٹھ کر روتے ہیں اس نگری کے لوگ
سہمے سہمے سے بیٹھے ہیں راگی اور فنکار
بھور بھئے اب ان گلیوں میں کون سُنائے جوگ[1]

اور ناصر جب سہمی سہمی نظریں لیے یہ خبر دیتا ہے کہ:

خیر ہو شہرِ شبنم و گل کی کوئی پھرتا ہے آس پاس اُداس

تو یہ "کوئی" کون ہے اور "کوئی" ناصر کی غزل میں ایک خاص کردار ہے۔ چونکہ ناصر ایک حقیقت پسند رومانوی ہیں اس لیے ان کی داخلی غزل میں حقیقت

---

[1] ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ "جدید شاعری"؛ (ناصر کاظمی اور برگِ نے) ص۔ ۵۰۲۔

بھی نقاب اوڑھے دکھائی دیتی ہے۔اس لیے تو ناصر بھی اس کی صحیح شناخت نہیں کروا سکتے۔ لیکن ان کو اپنی شاعرانہ چھٹی حس انہیں خبردار کئے دیتی ہے کہ "کوئی ہے" "کچھ" ہونے والا ہے۔ ناصر نے اپنے ذمے یہ کام لیا کہ وہ آنے والے خطرے سے آگاہ کرتے رہیں گے۔ البتہ انہوں نے ان خطروں کو دُور کرنے کے حل اور علاج نہیں بتائے۔ لیکن ایک حقیقت پسند رومانوی نے یہ توقع تو پوری کر ہی دی کہ وہ دھند سے پرے چلتے پھرتے ہیولوں کو دیکھ سکتا ہے اور محسوس کروا سکتا ہے۔

سہمے سہمے تھے رات اہلِ چمن تھا کوئی آدمی درختوں میں

کیا لگے آنکھ کہ پھر دل میں سمایا کوئی
رات بھر پھرتا ہے اس شہر میں سایا کوئی

یہ تو درست ہے کہ غزل کی نسبت نظم معاشرتی شعور میں بڑے پیمانے پر اضافہ کر سکتی ہے لیکن غزل بھی اس سے عاری نہیں کہی جا سکتی۔ دراصل یہ شعور غزل کی ایمائیت اور اشاریت میں چھپا ہوتا ہے۔ وہاں ایک خاص تہذیب اور ایک خاص معاشرے کی تصویریں سمٹی ہوتی ہیں۔ یہی رمزیت، ایمائیت اور اختصار اثر پذیری میں نظم کی تفصیل سے زیادہ گہرے اور دُور رس ہوتے ہیں۔ یہ جو ناصر ماضی کی طرف پلٹ پلٹ جاتے ہیں، قدم آگے اُٹھ رہے ہیں لیکن پیچھے مڑ مڑ کر بھی دیکھ رہے ہیں تو کیوں؟ وجہ یہ ہے کہ وہ دیکھ رہے ہیں کہ ماضی کی روایت بھی اُن کے ساتھ آ رہی ہے کہ نہیں۔ ماضی جو انہیں بے حد عزیز ہے، اس ماضی کی تلاش میں وہ میرؔ تک گئے۔ "روایت کے معنی علم اور تہذیب کی وہ تمام استعداد ہے جو انسان کو آج تک حاصل ہوئی ہے۔ یعنی روایت وہ روح ہے جو کسی عصرِ رواں میں دھڑکتی ہے اور اس روح کا ادراک اپنے زمانے پر نگاہ رکھنے ہی سے ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے ایک پس منظر لازمی ہے۔۔۔

زندہ روایت ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کرنا نہیں سکھاتی بلکہ اس کے ذریعے فن کار اپنے مقدر کے تارے کو پہچان سکتا ہے اور اس کی گردش کو قابو میں لانا انفرادی صلاحیت کے ذریعے ہی ممکن ہے.....

"انفرادیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ روایت کو سرے سے نظرانداز کر دے لیکن وہ روایت ہی خام ہے جس میں انفرادی اہمیت کے باوجود ایک ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمارے سامنے انفرادی صلاحیت کا مسئلہ زیادہ اہم ہے۔ میر کا "شب چراغ" تھوڑی دور تک رستہ دکھا سکتا ہے۔ منزل پر نہیں پہنچا سکتا۔ جو فن کار نئی روایت نہیں بنا سکتا وہ کوئی تخلیقی کارنامہ بھی نہیں کر سکتا۔" [1]

دراصل ناصر نے میر کی روایت کو اپنے اندر جذب کر لیا اور جب ان کے یہاں ان کی اپنی غزل آگئی تو اس میں یہ "میریت" اس طرح گھل گئی تھی کہ علیحدہ سے پہچانی نہ جاتی تھی۔ میر، ناصر کے لیے ایک تحریک بن گئے۔ انہیں نئے تخلیقی تجربوں کے اظہار کے لیے اکسانے والے بن گئے۔ میر سے مماثلت ناصر کی غزل کو طاقت دینے والا ایک عنصر ہے۔ یوں جب ناصر یہ کہتے ہیں کہ:

مل ہی جائے گا رفتگاں کا سراغ　　اور کچھ دن پھرو اُداس اُداس

تو ناصر کے ہاں یہ اُداسی بھی تخلیقی قوت بن گئی ہے۔ ناصر کے یہاں ان کی ذاتی اُداسی کی جو گھٹا اُمڈی تھی وہ ساری کائنات پر پھیل گئی۔ ناصر کی اداسی میں سارا جہان سمٹ آیا۔" ناصر کاظمی کے کلام میں ایک قسم کی زیرِ لب افسردگی ملتی ہے۔

---

[1] ناصر کاظمی: "سویرا" ۱۷-۱۸ (ایک مکالمہ - خوشبو کی ہجرت)

اس افسردگی کو نامرادی اور مریضانہ داخلیت سے تعبیر کرنا مناسب نہیں وہ اپنی ذات کے محدود گھروندے میں نہیں ہیں۔ میں نے پہلے کہا ہے کہ ان کی فراریت "نرگسیت" سے دور ہے۔ وہ نارکیسس کی طرح حوض میں اپنے عکس کو دیکھ کر صرف اپنی ذات سے دلچسپی لینے نہیں لگتے یا اپنی ذات سے محبت کر کے تمام دوسرے عناصر سے دامن نہیں چھڑا لیتے"۔ لے

ناصر کے ہاں اُداسی کا ایک خاص تصور ہے۔ انہیں اُداسی قنوطیت پسند نہیں بناتی، بلکہ انہیں حقیقت کو سمجھنے کا شعور بخشتی ہے۔ یہ اُداسی انہیں اپنی ذات کی گہرائیوں کو بھی پہچاننے میں مدد دیتی ہے:

تجھے کیا ہوگیا، بتا تو سہی — تو جو اتنا اُداس ہے ناصر
یہ کیا روگ لگا رکھا ہے — چُپ چپ کیوں رہتے ہو ناصر
رو لیتے ہیں پچھلی رات — بستی والوں سے چُھپ کر

مٹی مٹی سی امیدیں، تھکے تھکے سے خیال
بجھے بجھے سے نگاہوں میں غم کے افسانے

کر گئی پھر کسی کی آس اُداس — بیٹھے بیٹھے برس پڑیں آنکھیں
لیے پھرتی ہے کوئی باس اُداس — کوئی رہ رہ کے یاد آتا ہے

پھر یہی اُداسی پھیل کر معاشرے کی اُداسی بن جاتی ہے۔ اس لیے کہ وہ ہر طرف پھیلے دُکھ دیکھ رہے ہیں اور انہیں فکر ہے کہ:

کوئی پھرتا ہے آس پاس اُداس — خیر ہو شہرِ شبنم و گل کی
ہم سے پوچھے کوئی افسانۂ گل — ہم پہ گزرے ہیں خزاں کے صدمے

لے شکیل الرحمٰن "شاہراہ" دسمبر ۱۵۱ء (جدید شاعری کے نئے چراغ) تیسری قسط

دل تو میرا اداس ہے ناصر شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

دراصل بات یہ ہے کہ شاعر سارے معاشرے، پوری انسانیت کا نمائندہ ہوتا ہے اس لیے اس کا یہ فرض بلکہ حق ہے کہ وہ اپنی ذات سے آگے پھیل کر ان کے سُکھ اور دُکھ میں شامل ہو اور اگر اُسے اس قسم کا کوئی احساس ہو کہ :

شہر در شہر گھر جلائے گئے یوں بھی جشنِ طرب منائے گئے

اُڑ گئے شاخوں سے یہ کہہ کر طیور اس گلستاں کی ہوا میں زہر ہے

(برگِ نے)

چند گھرانوں نے مل جُل کر کتنے گھروں کا حق چھینا ہے

کارواں سست، راہبر خاموش کیسے گزرے گا یہ سفر خاموش

(دیوان)

پتھر کا وہ شہر بھی کیا تھا شہر کے نیچے شہر بسا تھا

لوگ بھی سارے پتھر کے تھے رنگ ان کا پتھر جیسا تھا

(پہلی بارش)

تو اُن کا اظہار اپنے کلام میں کر دینا چاہیے ۔ ناصر نے ایسا ہی کیا ہے ۔ بس یہ ہے کہ اُن کے مزاج کی رومانویت انہیں ان مسائل کے حل سوچنے کی طرف مائل نہیں کیا ۔ یوں بھی اعلیٰ شاعری (بلکہ ہر اعلیٰ فن پارے) کا مقصد کسی چیز کی پہچان کروانا ہے ۔ یہ الگ بات ہے کہ بہت سے ایسے عظیم شاعر بھی ہو گزرے ہیں جو پہلے خوب سوچ بچار کرتے ہیں پھر وہ جنت جو ہر شاعر نے اپنے اندر بسا رکھی ہوتی ہے اس کے نظام اقدار کو متعین کرتے ہیں اور پھر ان کا اظہار اس خوبصورتی سے اپنی شاعری میں کرتے ہیں کہ فن پارے کا وقار مجروح نہیں ہوتا ۔ ناصر بھی ایک جنت کی تلاش میں ہیں ۔

ایک اَن دیکھی بستی دھیان میں بسنی ہے اس بستی کے باسی مجھے بلاتے ہیں

وہ اس جنت کے بسنے کی راہ میں جو جو رکاوٹیں ہیں ان کی طرف دیکھنے اور غور کرنے کی تلقین ضرور کرتے ہیں لیکن یہ تلقین، شاعری میں ڈھل کر آتی ہے۔ یوں وہ اچھی منزلوں کی طرف جانے والی راہوں کی طرف بلیغ اشارے کرتے ہیں:

چڑھتے سورج کی ادا کو پہچان ڈوبتے دن کی ندا غور سے سُن
کبھی فرصت ہو تو اے صبحِ جمال شب گزیدوں کی دعا غور سے سُن

بدل سکو تو بدل دو یہ باغباں ورنہ یہ باغ سایۂ سرو سمن کو ترسے گا
ہوائے ظلم یہی ہے تو دیکھنا اِک دن زمین پانی کو، سورج کرن کو ترسے گا

ناصرؔ آشوبِ زمانہ سے غافل نہ رہو
کچھ ہوتا ہے جب خلقِ خدا کچھ کہتی ہے

خدا اگر کبھی کچھ اختیار دے ہم کو
تو پہلے خاک نشینوں کا انتظام کریں

یہ بجا کہ آج اندھیر ہے ذرا رُت بدلنے کی دیر ہے
جو خزاں کے خوف سے خشک ہے وہی شاخ لائے گی برگ و بر

یوں ناصرؔ نے "برگِ نَے" سے جو "اُداسی" اور "تنہائی" کا طویل سفر شروع کیا تھا، وہ اُمید اور رجائیت میں ڈھل گیا اور اُداسیاں اور تنہائیاں ناصرؔ کو نئی طاقت دے کر پھر سے ایک نئے سفر کے لیے تیار کر گئیں:

تیرے قدموں سے جاگیں گے اجڑے دلوں کے ختن
پاشکستہ غزالِ حرم صبر کو صبر کو
یہ محلاتِ شاہی تباہی کے ہیں منتظر
گرنے والے ہیں ان کے علم صبر کو صبر کو

پہلے کھُل جائے دل کا کنول پھر لکھیں گے غزل
کوئی دم اے صریرِ قلم صبر کو صبر کو

اور بالآخر:

گہری نیند سے جاگو ناصر
وہ دیکھو سُورج نکلا ہے

"دُشمن معاشرے میں شاعر کا کام بڑا کٹھن ہوتا ہے۔ معاشرے سے اس کی جنگ بڑے تدبّر کی جنگ ہوتی ہے۔ کسی ایک قدر کا ٹوٹنا - اس کی سلطنت پر یورش ہوتی ہے۔ شاعر کبھی کبھی حالات کے جبر کے تحت ہتھیار بھی ڈالتا محسوس ہوتا ہے:

اب تو خوش ہو جائیں اربابِ ہوس
جیسے وہ تھے ہم بھی ویسے ہو گئے

ہم بھلا چُپ رہنے والے تھے کہیں
ہاں مگر حالات ایسے ہو گئے

لیکن جب شاعر کو موقع ملتا ہے تو وہ شب خون مارنے سے باز نہیں آتا:

سرِ مقتل بھی صدا دی ہم نے
دل کی آواز سُنا دی ہم نے

پہلے اک روزنِ در توڑا تھا
اب کے بنیاد ہلا دی ہم نے[1]

ہماری اردو غزل کی روحِ رواں، محبت کا جذبہ ہے اور ناصر کاظمی کی غزل کا خاص موضوع عشق ہی ہے۔ مگر یہ عشق سطحی اور جامد نہیں ہے۔ اُن کے عشق کی وسعت میں زندگی کی پہنائیاں موجود ہیں[2]"۔ دراصل ناصر کے عشقیہ مضامین کی نوعیت دوسرے غزل گو شعراء کے پیش کئے ہُوئے مضامین سے مختلف ہے۔ ان مضامین میں نئی نسل کا وہ مزاج ہے جو محبوب کی پرستش نہیں کرتا۔ جس کو اس کے نام سے کبھی کبھی وحشت بھی ہوتی ہے[3]"۔ ناصر کو ایک محبوب ہستی ملی تو کہتی:

---

[1] ڈاکٹر سلام سندیلوی "خیابان" دسمبر ۶۴ء (اردو غزل)

[2] ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ "جدید شاعری" (ناصر کاظمی اور برگِ نے) ص ۴۹۱

لب جُو چھاؤں میں درختوں کی	وہ ملاقات تھی عجب کوئی

پہلی بارش، میں اور تُو	زرد پہاڑوں کا دامن

مہکی ہوئی سانس، نرم گفتار	ہر ایک روش پہ گُل کھلائے
راہوں پہ ادا ادا سے رقصاں	آنچل میں حیا سے منہ چھپائے

رنگ کھُلے صحرا کی دھوپ	زُلف گھنے جنگل کی رات

یہ سانحہ بھی محبت میں بارہا گزرا
کہ اُس نے حال بھی پوچھا تو آنکھ بھر آئی

لیکن پھر:

تو ہی بتا کہ تری خامشی کو کیا سمجھوں
تری نگاہ سے کچھ آشکار بھی تو نہیں

اور ہُوا یوں کہ:

ترے وصال کی اُمید اشک بن کے بہہ گئی
خوشی کا چاند شام ہی سے جھلملا کے رہ گیا
تو آنکھوں سے اوجھل ہوتا جاتا ہے
دُور کھڑے ہم خالی ہاتھ ہلاتے ہیں

شور برپا ہے خانۂ دل میں	کوئی دیوار سی گری ہے ابھی

پھر محبوب کی صرف یاد باقی رہ گئی:

ہم جس پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھا کرتے تھے
اب اس پیڑ کے پتے جھڑتے جاتے ہیں

وہ جس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر سفر کیا تو نے منزلوں کا
تری گلی سے نہ جانے کیوں آج سر جھکائے گزر گیا وہ

یا پھر خیال :

خیالِ حُسن میں کتنا بہار پرور ہے
شبِ خزاں کی خنک چاندنی کا نظارہ
ترے خیال سے لَو دے اٹھی ہے تنہائی
شبِ فراق ہے یا تیری جلوہ آرائی

یوں کس طرح کٹے گا کڑی دھوپ کا سفر
سر پر خیالِ یار کی چادر ہی لے چلیں

تب ناصر تڑپ اٹھتے :

کہاں ہے تو کہ ترے انتظار میں اے دوست
تمام رات سُلگتے ہیں دل کے ویرانے

اور جب محبوب نہ آیا تو Prince ناصر اپنی Princess [1]
حمیرا سے ناراض ہو گیا۔ "لو بھلا تمہاری میرے لیے کتنی اہمیت۔ تم تو مجھے یاد بھی نہیں آتیں" — وہی رومانوی شعرا کی حقیقت سے فرار کی کوشش۔ بھلا "بھول

---

[1] دیکھئے پہلا باب صفحہ نمبر ۲۶

جاؤں ، بھول جاؤں " کی تکرار کرنے سے بھی کوئی کسی کو بھولا ہے ، بلکہ یوں تو یاد
میں اور شدت آجاتی ہے ۔ ناصر کہنے کو تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ :

یہ کیا کہ ایک طور سے گزرے تمام عمر
جی چاہتا ہے اب کوئی تیرے سوا بھی ہو

ہوتی ہے تیرے نام سے وحشت کبھی کبھی
برہم ہوئی ہے یوں بھی طبیعت کبھی کبھی

لیکن اس کا کیا حل ہو کہ :

اے دوست ہم نے ترکِ محبت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

او پچھلی رُت کے ساتھی — اب کے برس میں تنہا ہوں
دل میں تیری یادوں نے — کیسے کیسے رنگ بھرے

سینے میں اُمنگوں کا وہی شور ہے اب تک
وہ شوخیٔ یک جنبشِ لب یاد رہے گی

بسا ہوا ہے خیالوں میں کوئی پیکرِ ناز
بُلا رہی ہے ابھی تک وہ دلنشین آواز

کوئی رہ رہ کے یاد آتا ہے — لیے پھرتی ہے کوئی باس اُداس
وہ کوئی دوست تھا اچھے دنوں کا — جو پچھلی رات سے یاد آ رہا ہے

ناصر کی یاد صرف محبت کی یاد نہیں ، بلکہ ناصر کو اور بھی بہت کچھ یاد ہے اور
بھی کئی ایسی یادیں ہیں اور انہیں بے چین کر دیتی ہے ۔ ایک اُن کے بچپن کے حسین
زمانوں کی یاد ؛ بچپن میں بھی وہی کھلا ہوا بنا ہے اپنا میت
جس نے اونچی ڈال سے توڑے زرد سنہری بیر

پھر اس مٹ چکی اور مٹتی ہوئی تہذیب کی یاد ہے جس میں ناصر پلے بڑھے۔
اب اِس غزل میں دیکھیے ناصر جو خود ایک دریا ہے ایک بھولی بسری کہانی سنا رہا ہے:

سُناتا ہے کوئی بھولی کہانی!
مہکتے میٹھے دریاؤں کا پانی
یہاں جنگل تھے آبادی سے پہلے
سُنا ہے میں نے لوگوں کی زبانی
یہاں اِک شہر تھا شہرِ نگاراں
نہ چھوڑی وقت نے اس کی نشانی،
مَیں وُہ دِل ہُوں دبستانِ الم کا!
جسے روئے گی صدیوں شادمانی
تصوّر نے اسے دیکھا ہے اکثر
خرد کہتی ہے جِس کو لامکانی
خیالوں ہی میں اکثر بیٹھے بیٹھے
بسا لیتا ہُوں اِک دُنیا سُہانی
بتا اے ظلمتِ صحرائے اِمکاں
کہاں ہوگا مِرے خوابوں کا ثانی
کرن پریاں اُترتی ہیں کہاں سے
کہاں جاتے ہیں رستے کہکشانی!
پہاڑوں سے چلی پھر کوئی آندھی
اُڑے جاتے ہیں اوراقِ خزانی

نئی دُنیا کے ہنگاموں میں ناصر
دبی جاتی ہیں آوازیں پُرانی!

ایک انوکھی بستی دھیان میں بستی ہے
اس بستی کے باسی مجھے بلاتے ہیں

وہ لوگ یاد آتے ہیں جو لاہور آنے سے پہلے انبالے میں چھوڑ آئے۔ وہ بھی جنہیں ناصر "رفتگاں" کہتے ہیں اور وہ بھی جو تہذیب و اقدار کی ایسی نشانیاں تھیں جو اب مٹتی جا رہی ہیں:

جب بھی نئے سفر پہ جاتا ہوں ناصر
پچھلے سفر کے ساتھی دھیان میں آتے ہیں

ساری رات جگاتی ہے
بیتے لمحوں کی جھانجن

وہ کوئی دوست تھا اچھے دنوں کا
جو پچھلی رات سے یاد آ رہا ہے

دشتِ غربت میں یادِ وطن پھول ہے
اُس کی خوشبو دکھاتی ہے کیا کیا سمے

لوگ تھے رفتگاں میں کیا کیا کچھ
رونقیں تھیں جہاں میں کیا کیا کچھ

یہاں جو حادثے کل ہو گئے ہیں
انہیں صدیوں نہ بھولے گا زمانہ

کوئی بھی ہم سفر نہ تھا شریکِ منزلِ جنوں
بہت ہوا تو رفتگاں کا دھیان آ کے رہ گیا

پھر اس کی یاد میں دل بے قرار ہے ناصر
بچھڑ کے جس سے ہوئی شہر شہر رسوائی

آ کے منزل پہ آنکھ بھر آئی   سب مزہ رفتگاں نے چھین لیا

دلِ ویراں میں دوستوں کی یاد   جیسے جگنو ہوں داغ میں گُل کے

کیا زمانہ تھا کہ ہم روز ملا کرتے تھے
رات بھر چاند کے ہمراہ پھرا کرتے تھے

ناصر کے ہاں خاص کیفیتوں کے اشعار ملتے ہیں۔ یہ ناصر کی غزل کی انفرادیت بھی ہے جس سے بعد کے شعراء نے بہت اثر لیا۔" ناصر کاظمی نے فراق سے کیفیت نمائی کا انداز لے کر اسے جدید (جدید تر نہیں) غزل کے ایک نئے دور کا نعرۂ جہاد بنا دیا...... ناصر نے غزل کو کیفیتوں کی دریافت و اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ کیونکہ انہیں اس کا احساس ہے کہ اب تک غزل سے جذبہ و خیال کی ترجمانی کا کام تو لیا گیا ہے، لیکن رنگ، فضا، احساس و کیفیت کے بہت سے نقوش روشن نہیں ہونے پائے ہیں[۱]"۔ خود احساس و جذبہ کی بعض ایسی صورتیں ہیں جن کا اظہار کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ ایسی صورتیں اگر اشعار کے ذریعے پڑھنے والے پر وہی کیفیت طاری کر دیں جو شاعر پر گزری تھی تو یہ ہوگی کیفیتوں کی شاعری۔ ناصر کے ہاں کیفیت کئی اسرار چھپائے ہوئے ہے۔ خاموش مگر بولتی ہوئی، بہت کچھ کہتی ہوئی کیفیتیں:

ریل کی گہری سیٹی سن کر   رات کا جنگل گونجا ہوگا
شہر کے خالی اسٹیشن پر   کوئی مسافر اترا ہوگا

---

[۱] ڈاکٹر حنیف فوق۔ "فنون" جدید غزل نمبر ۶۹ء "اردو کے زاویے" ص ۱۱۷۔

سب اپنے گھروں میں لمبی تان کے سوتے ہیں
اور دور کہیں کوئل کی صدا کچھ کہتی ہے

سو گئے لوگ اُس حویلی کے ایک کھڑکی مگر کھُلی ہے ابھی

تو ہے اور بے خواب دریچے میں ہوں اور سنسان گلی ہے

کُنج میں بیٹھے ہیں چُپ چاپ طیور برف پگھلے گی تو پر کھولیں گے

مندرجہ ذیل غزل قاری یا سامع کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ یوں لگتا ہے ساری کائنات اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھے، سانس تھامے بیٹھی ہے، منتظر ہے کسی تبدیلی کی۔ ایسے انقلاب کی جو ہر اچھی شے کے حق میں ہو۔ گویا یہ خاموشی کسی بڑے طوفان کا پس منظر ہو۔

اُس گلی کے گزرنے والوں کو!
تکتے رہتے ہیں بام و در خاموش
یہ زمیں کس کے انتظار میں ہے
کیا خبر کیوں ہے یہ نگر خاموش
شہر سوتا ہے رات جاگتی ہے
کوئی طوفاں ہے پردہ در خاموش
ابھی وُہ قافلے نہیں آئے
ابھی بیٹھیں نہ ہم سفر خاموش

اب یہ اشعار دیکھیے:

میں ہوں رات کا ایک بجا ہے
خالی رستہ بول رہا ہے

آج تو یوں خاموش ہے دنیا
جیسے کچھ ہونے والا ہے

سہمے سہمے بیٹھے رات اہل چمن
تھا کوئی آدمی درختوں میں

چہکتے بولتے شہروں کو کیا ہُوا ناصر
کہ دن کو بھی مرے گھر میں وہی اُداسی ہے

اکیلے گھر سے پوچھتی ہے بے کسی
ترا دیا جلانے والے کیا ہوئے

کیسے سنسان ہیں آسماں چپ کھڑے ہیں مکاں
ہے فضا اجنبی اجنبی، سو رہو سو رہو
چاندنی اور دھوئیں کے سوا دور تک کچھ نہیں
سو گئی شہر کی ہر گلی سو رہو سو رہو
منہ اندھیرے ہی ناصرؔ کسے ڈھونڈنے چل دیے
دور ہے صبح روشن ابھی سو رہو سو رہو

جنگل جاگے، ہوا چلی
چونک پڑی ہرنوں کی ڈار

کئی شعر ایسے ہیں جن میں تجسس بھرا ہوتا ہے اور باتوں میں Suspense پیدا

کئے رکھنا ناصر کو پسند بھی تھا۔ یہ ان کی عادت بن گئی تھی۔ پھر اُن کو اس میں کمال بھی حاصل تھا:

خیر ہو شہر شبنم و گل کی | کوئی پھرتا ہے آس پاس اُداس
آج کی رات نہ سونا یارو | آج ہم ساتواں در کھولیں گے
چیختی ہیں ڈراؤنی راتیں | چاند نکلا ہے آسماں سے دور

"رات" ناصر کو بے حد عزیز ہے "ناصر کی دلی آرزو تو یہ تھی کہ دنوں کو سو کر اور راتوں کو جاگ کر زندگی گزارے۔ اُس کے لیے دن ہنگاموں اور بے معنی مصروفیت کی چیز تھا اور رات زندگی کی معنویت اور تخلیق کا منبع۔ راتوں کو دوستوں کی محفل میں لچھے دار گفتگو کرنا اور سڑکوں پر ٹہلنا اُس کا دلچسپ مشغلہ تھا...... اُس کی پوری زندگی کے سفر کا حاصل ہجر کی راتوں کا طویل سلسلہ، اُداسیوں کی مجسّم تصویریں، سفر کی گرد اور زندگی کی بے حاصلی تھی۔"[۱] خود ناصر نے کہا:

"اصل میں رات میری شاعری میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی وجہ رات، اندھیری رات نہیں یا وہ جسے ہمارے جدید شاعر ایک تاریکی کا استعارہ کہتے ہیں۔ رات تخلیق کی علامت ہے۔ دنیا کی ہر چیز رات میں تخلیق ہوتی ہے۔ پھولوں میں رس پڑتا ہے رات کو۔ سمندروں میں تموج ہوتا ہے رات کو۔ خوشبوئیں رات کو جنم لیتی ہیں حتیٰ کہ فجر تک فرشتے رات کو اُترتے ہیں۔ سب سے بڑی وحی بھی رات کو نازل ہوتی۔ ایک یہ بات، دوسری بات یہ ہے کہ تم نے جوان راتوں کا ذکر کیا تو اب بھی راتیں جاگتی ہیں لیکن شہر سویا ہوا ہے۔"[۲]

شہر اس لیے سویا ہے کہ ناصر جیسے شاعر اسے جگانے کے لیے نہیں آرہے اور

۱۔ سجاد باقر رضوی "راوی" اپریل ۷۲ء (تنہائی کا سفر) ص ۲۰

۲۔ ناصر کاظمی۔ ٹی وی انٹرویو

یوں شہر کائنات بن جاتا ہے اور جاگنے والے صرف باشعور اور رکھوالے ہوگ رہ جاتے ہیں۔

داتا کی نگری میں ناصرؔ ‏ ‏ میں جاگوں یا داتا جاگے

میں کیوں پھرتا ہوں تنہا مارا مارا ‏ ‏ یہ بستی چین سے کیوں سو رہی ہے

ساری بستی سو گئی ناصرؔ ‏ ‏ تو اب تک کیوں جاگ رہا ہے

"رات جتنی بھیگتی اُس کی آنکھوں میں چمک اور اُس کی آواز میں گرمی پیدا ہوتی جاتی۔ اُس کا تخیل بہک کر کہیں سے کہیں نکل جاتا۔ میرؔ کے شعر پڑھتے پڑھتے اُسے سُور داس کا کوئی دوہا یاد آجاتا۔ کبھی سُور داس کبھی کبیر (ناصر کو میرا بائی کے بھجن بھی تو بے حد پسند تھے۔ ان کے نزدیک میرا بائی اُداسی کی بہن ہے) مگر جب تڑکا ہونے لگتا تو ناصر چپ ہو جاتا۔ چُپ اور اُداس اور اُسے نیند آنے لگتی" [1]

دراصل ناصرؔ کے ہاں ایک شاعر ہی سوال نہیں کرتا بلکہ یہ کائنات، اس کے مظاہر، فطرت کی سبھی چیزیں کچھ کہتی ہوئی محسوس ہو رہی ہیں۔ یہ کیا کہہ رہی ہیں؟ اس کی وضاحت ناصرؔ نے اپنے ذمہ نہیں لی۔ یہ ذمہ داری اس نے پڑھنے والے کی سمجھ کے سپرد کر دی ہے:

یہ ٹھٹھری ہوئی لمبی راتیں کچھ پوچھتی ہیں
یہ خامشیِ آواز نما کچھ کہتی ہیں

رات بھر ہم نہ سو سکے ناصرؔ ‏ ‏ پردۂ خامشی میں کیا کچھ تھا

---

[1] انتظار حسین "راوی" اپریل ۱۹۷۲ء (ناصر کاظمی۔ نیند کی تلاش میں) ص ۲۴

رات بھر جاگتے رہتے ہو بھلا کیوں ناصرؔ
تم نے یہ دولتِ بیدار کہاں سے پائی

بجھی بجھی سی ہے کیوں چاند کی ضیا ناصرؔ
کہاں چلی ہے یہ کاسہ اٹھائے شامِ فراق

ناصرؔ نے ایک بار کہا تھا کہ "فطرت تو اسی طرح ہے، تارے نکلتے ہیں، ٹوٹتے ہیں۔ آنکھیں جھپکاتے ہیں اور ڈوب جاتے ہیں۔ سورج نکلتا ہے، ناچتا ہے اور پھر اوجھل ہو جاتا ہے۔ درخت اسی طرح بستے اجڑتے رہتے ہیں لیکن موسم بدل گئے ہیں۔ سبزہ لہکتا ہے لیکن شہر کے دھوئیں میں جھلس جاتا ہے۔ پھول کھلتے ہیں لیکن انہیں کوئی نہیں دیکھتا۔ دل اب بھی دھڑکتے ہیں لیکن آہنی مشینوں کے شور میں ان کی آواز کوئی نہیں سنتا۔"[1] جبکہ ناصرؔ یہ سب کچھ دیکھ بھی رہے ہیں اور سن بھی رہے ہیں۔ ان کا بھی مشہور مصور لیونارڈ وڈا ونچی کی طرح یہی خیال معلوم ہوتا ہے کہ "یہ ساری خوبصورتی یہ سارا حسن فنا ہو جائے گا، اسے آرٹ میں محفوظ کر لو۔" ناصرؔ کی رات کے بارے میں شاعری ایسی ہے کہ اسے رات میں پڑھو تو پُراسرار کیفیت اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ اُداسی کی ایک فضا ہے لیکن یہ اُداسی ایسی نہیں ہے جو چلتے قدموں کو تھام لے، جی چاہتا ہے اس اُداسی کے خوبصورت غار میں اُتر کر نئی دنیا دیکھیں اور خاموش پُرسکون فضا میں کچھ سوچیں اور سوچتے چلے جائیں۔ یہاں تنہائی بھی ہے لیکن خاموش ساتھی بھی ہیں، چاند، تارے اور کہکشاں سڑکیں اور روشنیاں :

گلشنِ فکر کی منہ بند کلی   شب مہتاب میں وا ہوتی ہے
شب کی تنہائیوں میں پچھلے پہر   چاند کرتا ہے گفتگو ہم سے

---

[1] ناصر کاظمی ۔ رسالہ "نیا دور" ۷ - ۸ (نیا اسم) ص - ۸۸

رین اندھیری ہے اور کنارا دور   چاند نکلے تو پار اتر جائیں

نیندیں بھٹکتی پھرتی ہیں گلیوں میں ساری رات
یہ شہر چھُپ کے رات کو سوتا ہے آب میں

چاند نکلا افق کے غاروں سے   آگ سی لگ گئی درختوں میں

نیند آتی نہیں تو صبح تلک   گردِ مہتاب کا سفر دیکھو

میکدہ بجھ گیا تو کیا رات ہے میری ہمنوا
سایہ ہے میرا ہم سبو چاند ہے میرا ہم سخن

کسے ملیں کہاں جائیں کہ رات کالی ہے
وہ شکل ہی نہ رہی جو دیئے جلاتی تھی

اس شہرِ بے چراغ میں جائے گی تو کہاں
آ اے شبِ فراق تجھے گھر ہی چلیں

یار کی نگری کوسوں دور   کیسے کٹے گی بھاری رات

کئی دن رات سفر میں گزرے   آج تو چاند لبِ جُو نکلا

شہرِ گل میں کٹی ہے ساری رات　　دیکھیے دن کہاں گزرتا ہے

اولیں شبِ گلشن کس قدر سہانی تھی
اجنبی مہک پاکر ہم نکل پڑے گھر سے

ناصر نے رات کے وقت تلاش اور ڈھونڈنے کا عمل جاری رکھا تو پھر ہوا یوں کہ وہ رات کو جگانے والے بن گئے اور رات انھیں جگانے آنے لگی۔ ناصر دھندلی دھندلی فضاؤں میں کچھ ڈھونڈتے ڈھونڈتے دور نکل جاتے۔ کوئی نہ ملتا تو خود ہی ہیولے بنا لیتے اور آخر یوں ہوتا کہ :

سو گیا پچھلی رات کا جادو　　کوئی اب لے چلے یہاں سے دور

صبح کا تارا ابھر کر رہ گیا　　رات کا جادو بکھر کر رہ گیا

دن نکلنے میں کوئی دیر نہیں　　ہم نہ سو جائیں اب تو ڈر ہے یہ

خاک بھی اڑ رہی ہے رستوں میں　　آمدِ صبح کا سماں بھی ہے

دن کا چراغ نکلا گُل ہو گئے ستارے
دنیا کے شور و غل میں دل اب کسے پکارے

یوں زندگی کے رات دن گزارتے گزارتے وہ وقت بھی آگیا کہ :

وہ میکدے کو جگانے والا　وہ رات کی نیند اڑانے والا
یہ آج کیا اُس کے جی میں آئی کہ شام ہوتے ہی گھر گیا وہ

وہ رات کا بے نوا مسافر وہ تیرا شاعر وہ تیرا ناصرؔ
تری گلی تک تو ہم نے دیکھا تھا، پھر نہ جانے کدھر گیا وہ

اور آخر رات اکیلی رہ گئی۔ اس لئے کہ:

وہ ہجر کی رات کا ستارا وہ ہم نفس ہم سخن ہمارا
سدا رہے اُس کا نام پیارا، سنا ہے کل رات مر گیا وہ

اور رات کی آنکھوں میں شبنمی آنسو اتر آئے:

کبھی کبھی کوئی روشنی ہے
جو آتے جاتے سے پوچھتی ہے
کہاں ہے وہ اجنبی مسافر
کہاں گیا وہ اُداس شاعر

ناصرؔ کے ہاں قافلوں کی گھنٹیاں بھی بجتی ہیں۔ یہ قافلے اپنے اندر ہجرت کے دُکھوں کی گٹھڑیاں اٹھائے رواں دواں ہیں۔ یوں تو ہجرت نے مکروہ حقیقتوں کے علاوہ ناصر کو حسین یادوں کے خزانے بھی فراہم کئے لیکن یہی ہجرت ان کی شاعری کو حُسن بخش دینے والے کاروانوں اور قافلوں کے مناظر اور استعارے بھی دے گئی۔ ان سے پہلے بھی غزل میں قافلوں اور کاروانوں کا ذکر آیا ہے لیکن سُنی سنائی کی بات اور ہے اور دیکھی اور محسوس کی ہوئی بات بالکل الگ چیز ہے۔ ناصر نے تو تجربوں کے کرب سہے، تب جا کر ہمیں بھی یہ محسوس ہُوا کہ ہم خود ناصرؔ کے ساتھ قافلوں اور کاروانوں کے مسافر بن گئے ہیں۔ کارواں ناصرؔ کے ہاں صرف ہجرت کی علامت نہیں ہے بلکہ یہ لفظ تو اب ایک معاشرے، ایک تہذیب اور پھر ایک قوم اور ایک ملک کا استعارہ بن گیا ہے:

شہر خلقِ خدا سے بیگانہ کارواں میر کارواں سے دور

کارواں سست راہبر خاموش کیسے گزرے گا یہ سفر خاموش

رات اندھیری ہے تو اپنے دھیان کی مشعل جلا
قافلے والوں میں کس کو کس کی پروا ہے نہ پوچھ

ناصر کبھی تو کاروانوں کے ساتھ ساتھ چلتے رہے :

منزل نہ ملی تو قافلوں نے
رستے میں جما لیے ہیں ڈیرے
جنگل میں ہوئی ہے شام ہم کو
بستی سے چلے تھے منہ اندھیرے
روداد سفر نہ چھیڑ ناصر
پھر اشک نہ تھم سکیں گے میرے

اور کبھی کبھار بھٹک جاتے اور کھوئی ہوئی تہذیبی اقدار کے کاروانوں کی گھنٹیوں کو سننے کی کوشش میں دور نکل جاتے ۔ اس لئے ان کے ہاں چلنے پھرنے اور سفر کرنے کا ذکر بہت آتا ہے ۔ پھر ان کے ہاں "آمدِ صبح"، "منہ اندھیرے"، "قافلے"، "منزل"، "رستے"، "شفق"، "کنارہ"، "بستی" کا بیان بھی ہے اور "رفتگاں" کی یاد بھی :

آ کے منزل پہ آنکھ بھر آئی　　سب مزہ رفتگاں نے چھین لیا

خبر نہیں وہ مرے ہمسفر کہاں پہنچے
کہ رہگزر تو مرے ساتھ ہی پلٹ آئی

شکستہ پا راہ میں کھڑا ہوں گئے دنوں کو بلا رہا ہوں
جو قافلہ میرا ہمسفر تھا مثالِ گردِ سفر گیا وہ

میں بھٹکتا پھرتا ہوں دیر سے یونہی شہر شہر، نگر نگر
کہاں کھو گیا مِرا قافلہ، کہاں رہ گئے مرے ہم سفر

وہ صبح آتے آتے رہ گئی کہاں   جو قافلے تھے آنے والے کیا ہوئے

لیکن ناصر نے انتظار جاری رکھا، اس لیے کہ انھیں یقین تھا کہ کھوئی ہوئی چیزوں کا سراغ مل ہی جائے گا:

رہ نوردِ بیابانِ غم   صبر کر صبر کر
کارواں پھر ملیں گے بہم   صبر کر صبر کر

دراصل ناصر مکمل اور سچے فنکار تھے اور ایسے فنکار ایک سدا بہار ندی، ایک ہمیشہ رواں رہنے والے دریا کی مانند ہوتے ہیں۔ ان کی تخلیقی روانی کبھی نہیں تھمتی۔ ان کے ہمکتی لہروں والے دریا کا پانی خشک نہیں ہوتا۔ اس لیے ناصر کے ہاں بھی تخلیقی سفر جاری رہا۔ ان کے فکروفن میں مثبت تبدیلی آتی رہی اور ترقی ہوتی رہی۔ اسی ناصر کے فکروفن" برگِ نے" سے" دیوان" اور پھر" پہلی بارش" تک مسلسل ارتقا پذیر رہے۔ ناصر سے ٹی وی انٹرویو میں جب سوال کیا گیا کہ 'برگِ نے' کے بعد تم کیا کرتے رہے؟ لوگ کہتے ہیں کہ اس کے بعد ناصر کاظمی خاموش ہو گیا" تو ناصر نے جواب دیا: برگِ نے' کے بعد دراصل میری شاعری کا جو ایک لحاظ سے بہتر اور باقاعدہ تخلیقی دور ہے میرے خیال میں وہ —— اتنا خوبصورت دور تو نہیں لیکن وہ "برگِ نے" کے بعد ہی شروع ہوا۔ میں 'برگِ نے' کے بعد لکھتا رہا اور لکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر چھپتا کم رہا ہوں .... دراصل میری زندگی کا تو مقصد ہی بھائی یہ ہے کہ فرصت کماؤں اور اس فرصت میں شعر لکھوں"۔[1] اپنی شاعری کے شروع زمانے میں

---

[1] ناصر کاظمی ٹی۔ وی انٹرویو ۷۲ء۔ انٹرویو لینے والے تھے۔ انتظار حسین۔

ناصر نے ایک گفتگو کے دوران میں حنیف رامے کی بات کا جواب مبہم طریقے سے بالکل رومانوی انداز میں یوں دیا تھا:

"حنیف رامے :۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ریل گاڑی کا مسافر روایت اور تجربے کا سنگم ہے۔ وہ بہ یک وقت موجود بھی ہے اور غائب بھی۔ وہ نہ تو معاشرے میں گم ہے اور نہ معاشرے سے بالکل کٹا ہوا ہے۔ معاشرے میں رہتے ہوئے وہ تنہا ہے۔

ناصر کاظمی :۔ یہیں سے فرد کی تخلیقی تنہائی شروع ہوتی ہے۔ جو ہرن زخمی ہو جاتا ہے ڈار سے جلدی ہی بچھڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک آدھ میل تو وہ گرمی میں ڈار کے ساتھ بھاگتا ہے لیکن پھر کسی اکیلے غار یا بن میں چھپ کر بیٹھ جاتا ہے۔ یہی اکیلا ہرن سب ہرنوں سے زیادہ اجتماعی شعور رکھتا ہے۔" [1]

یہاں یہ بات الجھ جاتی ہے کہ آخر اکیلا رہ کر بھی اجتماع کا مستقل شعور کیسے برقرار رہ سکتا ہے۔ لیکن تقریباً پندرہ بیس سال بعد وہ کہتے ہیں:

بات یہ ہے کہ باہر کی چیزیں جب اچھی لگتی ہیں جب آدمی کے اندر کچھ زندگی ہو۔ دریا اُس شخص کو بہتا دکھائی دیتا ہے جس کے اندر دریا ہو:

؎ میر دریا ہے سنے شعر زبانی اُس کی

تو یہ دریا کا احساس تو اندر ٹھاٹھیں مارتا ہے، دریا مزاج۔ اسی طرح سے درخت ہے۔ آپ کو پتا ہے کہ یہیں سے تو دنیا شروع ہوئی۔ سو یہ درخت تو Growth کا Symbol ہے اور میری شاعری کا جزوِ اعظم ہے۔ درخت، شہر، چاند، پھول، فطرت Romantic چیزیں نہیں ہیں۔ انتظار حسین!! دراصل یہ ایک بڑی مہذب تہذیب، جسے صدیوں میں انسان نے خون دے دے کر پالا ہے،

---

[1] ایک اقتباس۔ رسالہ "سویرا" ۱۹-۲۰-۲۱ (ایک مکالمہ۔ رفتار کا بدن) ص۔ ۲۹۵

اس کے استعارے ، اس کی زندہ علامتیں ہیں۔ آپ اندازہ کریں جس شہر میں درخت ہوں ، پرندے ہوں ، کبوتر ہوں ، چڑیاں ہوں ، آسمان کھُلے ہوں وہ کوئی Romance نہیں Romantic کون کہتا ہے اسے !!! اس کے پیچھے تصور کرو اُس معاشرے کا کہ کیسے لوگ بستے ہیں گے جنہوں نے وہ "پھول" لگائے ہیں، وہ "درخت" بنائے ہیں۔" [1]

اب ان دو مختلف اوقات میں کہی گئی باتوں میں بہت فرق ہے اور پہلی بات سے دوسری بات تک کے درمیان تقریباً پندرہ برس کی مدت ہے اور اس عرصے میں ناصر کی فکر میں واضح تبدیلی سے نظریں نہیں چرائی جاسکتیں۔ اب ان کی شاعری کی ہر چیز کی وابستگی زندگی سے، اِردگرد کے ماحول سے، معاشرے اور انسانیت سے ہو جاتی ہے۔ اب زخم کھا کر تنہائی میں نکل جانے والا ہرن ناصر کے نزدیک اجتماعی شعور کا نہیں رہا ہے۔ اب وہ فطرت کے پیش منظر میں نظریں گاڑ کر پس منظر میں جاتے ہیں جہاں انسانی معاشرہ سرگرمِ عمل ہے، اور پھول کو محض اس لئے نہیں دیکھتے کہ پھول ہے اور خوبصورت ہے۔ اب وہ یہ پھول اور درخت لگانے والوں، انہیں پروان چڑھانے والوں، ان پر محنت کرنے والوں کے بارے میں بھی سوچنے لگے ہیں۔

ناصر کو جو شروع میں اُداسیاں ملیں انہوں نے ناصر کو جلا کر راکھ نہیں کر دیا بلکہ ناصر نے ان اُداسیوں کو اپنے اندر تحلیل کر لیا۔ یوں اس راکھ سے جو سورج طلوع ہُوا وہ رجائیت کا سورج ہے۔ اس کی کرنیں ناصر کی فکر میں مثبت تبدیلیوں یعنی امید اور رجائیت کی عکاس ہیں۔ اس رجائیت کی چنگاری جو شدید غموں اور صدموں سے پہلے بھی ان کے اندر بسی ہوئی تھی:

مایوس نہ ہو اداس راہی　　　پھر آئے گا دورِ صبحگاہی

---

[1] ناصر کاظمی۔ ٹی وی انٹرویو ۷۲ء۔ انٹرویو لینے والے تھے۔ انتظار حسین

یہ چنگاری اب "دیوان" میں آکر اُمید کی صورت میں بھڑک اٹھی :

گہری نیند سے جاگو ناصرؔ   وہ دیکھو سورج نکلا ہے

گئے دنوں کی لاش پہ پڑے رہو گے کب تلک
الم کشو اُٹھو کہ آفتاب سر پہ آگیا

تلخ حقائق اب ان کے میٹھے خوابوں کو کڑواہٹ نہیں دیتے بلکہ اب تو وہ اس کی فکر بھی کرتے ہیں کہ آخر چاروں طرف اتنی تلخی کیوں ہے ؟ آخر چند لوگوں نے کیوں ڈھیر سے لوگوں کے خوابوں تک سے شیرینی چھین لی ہے :

کڑوے خواب غریبوں کے   میٹھی نیند امیروں کی

چند گھرانوں نے مل جل کر   کتنے گھروں کا حق چھینا ہے
میلی چادر اوڑھنے والے   تیرے پاؤں تلے سونا ہے

جھوٹی اُمید کا فریب نہ دکھاؤ   رات کالی ہے کس قدر دیکھو

ایک انوکھی بستی دھیان میں بستی ہے   اس بستی کے باسی مجھے بلاتے ہیں

یہ بھی آرائشِ ہستی کا تقاضا تھا کہ ہم
حلقۂ فکر سے میدانِ عمل میں آئے

بیٹھے ہو کیوں ہار کے ، سائے میں دیوار کے
شاعرو ، صورت گرو کچھ تو کیا چاہیئے

یارو تم تو ایک ڈگر پر ہار کے بیٹھ گئے
ہم نے تپتی دھوپ میں کاٹے کڑے کوس کے پھیر

لہو کی شمعیں جلاؤ قدم بڑھائے چلو
سروں پہ سایۂ شب ہائے تار اگر ہے بھی

اور پھر انھوں نے تسلی آمیز اور توقع سے بھرپور لہجے میں کہا:

کچھ نئے لوگ آنے والے ہیں گرم اب شہر میں خبر ہے یہ
یہ بجا کہ آج اندھیر ہے ذرا رُت بدلنے کی دیر ہے
جو خزاں کے خوف سے خشک ہے، وہی شاخ لائے گی برگ و بر

اور واقعی رُت بدل گئی۔ ناصر کی ڈھکی چھپی فکر کی کلی بھی کھل کر پھول بن گئی اور انھوں نے سب لگی لپٹی چھوڑ کر واضح طور پر کہہ دیا:

یہ خاص و عام کی بے کار گفتگو کب تک
قبول کیجیے جو فیصلہ عوام کریں

ناصر کو یہ خوف تو تھا کہ:

دن نکلنے میں کوئی دیر نہیں ہم نہ سو جائیں اب تو ڈر ہے یہ

لیکن ناصر میں جواب اُمید کی قوت اکٹھی ہو گئی تھی اب اسے اندھیرے بکھیر نہیں سکتے تھے:

وقت اچھا بھی آئے گا ناصرؔ غم نہ کر، زندگی پڑی ہے ابھی

"ناصر کاظمی صحیح معنوں میں انسانی زندگی کے شاعر ہیں۔ اس زندگی کے مختلف پہلوؤں سے انھوں نے دلچسپی لی ہے انھیں بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ان پر غور کیا ہے اور اس طرح زندگی کی بعض اہم حقیقتوں کا سراغ لگایا ہے۔ ان حقیقتوں کی تہہ تک وہ محسوسات کے راستے سے پہنچتے ہیں۔ ان کے یہاں فکری پہلو غالب نہیں ہے۔ وہ فلسفی نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی سے ان کی دلچسپی

ذہنی اور فکری ہونے کی بجائے محسوساتی اور عملی زیادہ ہے اور اسے دیکھنے، سمجھنے، برتنے اور بسر کرنے کے خیالات ان کی غزلوں میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ اسی لئے اس میں زندگی اور جولانی کا پتہ چلتا ہے۔ اور تنوع اور رنگا رنگی، وسعت اور ہمہ گیری کی خصوصیات اپنا جلوہ دکھاتی ہیں۔[1] ناصر بہت گہری باتیں تو نہیں کرتے لیکن سادگی سے کہی ہوئی یہ باتیں دل کو لگتی ضرور ہیں۔ ایک کسک سی ہوتی ہے۔ جذبے، احساس اور فکر میں ایک دھیما سا ارتعاش بلکہ اضطراب پیدا ہوتا ہے:

میں نے تو اک بات کہی تھی — کیا تو سچ مچ روٹھ گیا ہے
کھڑکی کھول کے دیکھ تو باہر — دیر سے کوئی شخص کھڑا ہے

شور برپا ہے خانۂ دل میں — کوئی دیوار سی گری ہے ابھی
بھری دنیا میں جی نہیں لگتا — جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی

کانٹے چھوڑ گئی آندھی — لے گئی اچھے اچھے پھول

ذرا سی بات سہی تیرا یاد آ جانا
ذرا سی بات بہت دیر تک رلاتی تھی

دھیان کی سیڑھیوں پہ پچھلے پہر — کوئی چپکے سے پاؤں دھرتا ہے

دل تو میرا اداس ہے ناصرؔ — شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

---

[1] ڈاکٹر عبادت بریلوی "جدید شاعری" (ناصر کاظمی اور برگِ نے) ص ۔ ۵۱۲

پھر ناصرؔ کے شعروں میں ایک اور اہم بات اور ناصرؔ کی انفرادیت کی ایک اور جھلک اس میں نظر آتی ہے کہ وہ اپنی تہذیبی اقدار کو نہیں بھولتے اور اپنے تہذیبی ورثے کو اس طرح شعروں میں سموتے ہیں کہ صاف معلوم ہوتا ہے یہ کوئی مقامی شاعر ہے۔ اسی پاکستان کا شاعر:

لال کھجوروں نے پہنے　　　　زرد بگولوں کے کنگن

ساری رات جگاتی ہے　　　　بیتے لمحوں کی جھانجن

جب نکلتی ہے نگارِ شبِ گل　　　　منہ پہ شبنم کی ردا ہوتی ہے

کیا تماشا ہے کہ بے ایامِ گل　　　　ٹہنیوں کے ہاتھ پیلے ہو گئے

غزل صرف فکر و تخیل سے ہی حسین اور لازوال نہیں بنتی بلکہ اس میں فنکار کا فن بھی شامل ہوتا ہے۔ ناصر کاظمی کی غزل اس لحاظ سے بھی جدت اور نیا پن لئے ہوتے ہے۔ یوں تو غزل کا ایک مخصوص حسین خاکہ صدیوں سے چلا آرہا ہے لیکن بڑے شاعر اس میں بھی رنگ تو اپنے ہی بھرتے رہے ہیں۔ آیئے اب ناصرؔ کی غزل کے چند ایک فنی پہلو دیکھیں۔

"غزل کی ہیئت اور اس کے جمالیاتی پہلو میں کسی مخصوص بحر کے انتخاب کو بڑا دخل ہے۔ فارسی اور اردو میں جتنی بحریں بھی رائج ہیں ان سب کا آہنگ مختلف ہے اور ان میں سے ہر ایک انسانی ذہن کی بعض مخصوص کیفیات سے مناسبت اور مطابقت رکھتی ہیں۔ بعضوں کی موسیقی پُر شور ہوتی ہے۔ ایسی بحروں کے اندر پہاڑوں کے دامن میں بہتی ہوئی ندیوں کا سا جوش ہوتا ہے۔ یہ بحریں انسان کے جذبات کی شدت، اس کے ذہنی ہیجان، اس کی طبیعت کی پُر شور کیفیت اور اس کے مزاج کی شورش کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس کے برخلاف بعض بحروں کے اندر میدانوں میں بہتی ہوئی سُبک خرام جوئے رواں کا سا ترنم ہوتا ہے۔ ان میں ایک

آہستہ روی اور نرمی کی خصوصیت پائی جاتی ہے۔ یہ بحریں ان کے انتخاب کرنے والے کے مزاج کے دھیمے پن، طبیعت کی بجھی ہوئی کیفیت، جذبات میں ایک قسم کے ٹھہراؤ کو ظاہر کرتی ہیں۔ اسی طرح بعض بحریں چھوٹی ہوتی ہیں، بعض طویل، بعض آسان ہوتی ہیں اور بعض مشکل اور سنگلاخ — ان بحروں میں سے مخصوص ذہنی جذبات اور کیفیات کو غزل کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے مخصوص بحروں کا انتخاب غزل گو شاعر کے شعور پر دلالت کرتا ہے .... بڑی حد تک اس انتخاب پر غزل کے تاثر کا انحصار ہوتا ہے۔"

ناصر کاظمی دھیمے لہجے کا شاعر ہے۔ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے دکھوں اور چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو اپنے ماحول کے پس منظر میں دیکھتا ہے اور ایک انوکھی سادگی سے انھیں بیان کر دیتا ہے[۱]۔ ناصر ایک حقیقت پسند رومانوی شاعر ہیں۔ اس لئے ان کے ہاں دو طرح کے لہجے ہیں: ایک نرمی سے بات کہنے کا انداز اور دوسرا نہایت اعتماد اور وقار سے ذرا بلند لہجے میں گفتگو کا انداز لیکن شائستگی بہرحال دونوں آوازوں میں موجود ہے اور یہی شائستگی ہے جو شروع سے آخر تک ان کی غزل کو نرمیاں دیتی ہے۔ ایک گھمبیرتا ہے جو ناصر کی شخصیت اور ان کی غزل کو بلندیوں کی طرف لئے چلی جاتی ہے۔ کبھی کبھی ایک چیخ بلند ہوتی ہے لیکن یہ شہنائی یا بانسری کے سب سے اونچے سُر کی سی ہوتی ہے۔ اس میں آرکسٹرا والے شور کی سی کوئی بات نہیں ہوتی۔ مناسب ہو گا اگر ہم "برگِ نے"، "دیوان" اور "پہلی بارش" کی بحروں پر ایک نظر ڈال دیں۔ اس لئے کہ بحریں ہی تو لہجے متعین کرتی ہیں۔ ناصر کی پسندیدہ بحر "رونقیں تھیں جہاں میں کیا کیا کچھ" (فاعلاتن مفاعلن فعلن ہے) اس بحر میں انھوں نے "برگِ نے" کی ۱۵ غزلیں اور "دیوان" کی ۱۷ غزلیں کہیں۔ ان کی دوسری پسندیدہ بحر "گرفتہ دل ہیں بہت آج تیرے دیوانے" (مفاعلات فعولن فعاعلن فعلن) ہے۔ اس بحر میں "برگِ نے" کی ۹ غزلیں کہیں اور "دیوان" کی ۱۴ غزلیں اس بحر میں ہیں باقی بحروں کی تعداد یوں ہے:

---

[۱] ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ "غزل اور مطالعۂ غزل" (غزل کا جمالیاتی پہلو) ص۔ ۱۸۵-۱۸۶

بحر	برگ نے	دیوان
۳- ختم ہوا تاروں کا راگ	۷	۱۳
۴- کچھ تو احساسِ زیاں تھا پہلے	۱۱	۷
۵- کیا دن مجھے عشق نے دکھائے	۹	–
۶- ہوتی ہے تیرے نام سے وحشت کبھی کبھی	۲	۶
۷- حاصلِ عشق ترا حُسنِ پشیماں ہی سہی	۳	۴
۸- ترے ملنے کو بے کل ہو گئے ہیں	۴	۳
۹- کم فرصتیِ خوابِ طرب یاد رہے گی	۲	۴
۱۰- دورِ فلک جب دہراتا ہے موسمِ گُل کی راتوں کو	۱	۳
۱۱- نہ آنکھیں ہی برسیں نہ تم ہی ملے	۲	–
۱۲- گلی گلی آباد تھی جن سے کہاں گئے وہ لوگ	۱	۱
۱۳- کبھی کبھی تو جذبِ عشق مات کھا کے رہ گیا	۱	۱
۱۴- دن ڈھلا رات پھر آ گئی سو رہو سو رہو	۱	۱
۱۵- ہر ادا آبِ رواں کی لہر ہے	۱	۲
۱۶- قفس کو چمن سے سوا جانتے ہیں	۱	–

مندرجہ ذیل بحریں صرف "دیوان" میں اپنائی گئیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ناصر کے لہجے میں وسعت اور تنوع آگیا ہے:

بحر	دیوان
۱۷- پھر ساون رُت کی پون چلی تم یاد آئے	۲
۱۸- نوا سیرِ بزم ہے ہم سخن تجھے ذوقِ نالہ نے نہیں	۳
۱۹- موسمِ گلزارِ ہستی ان دنوں کیا ہے نہ پوچھ	۲

بحر	دیوان
۲۰۔ ہم جس پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھا کرتے تھے	۱
۲۱۔ دل کے لیے درد بھی روز نیا چاہیئے	۱
۲۲۔ زمیں چل رہی ہے کہ صبحِ زوالِ زماں ہے	۱
۲۳۔ درد کانٹا ہے اس کی چبھن پھول ہے	۲
۲۴۔ رات ڈھل رہی ہے	۱
۲۵۔ کیا زمانہ تھا کہ ہم روز ملا کرتے تھے	۱
۲۶۔ چہرہ افروز ہوئی پہلی جھڑی ہم نفسو شکر کرو	۱
۲۷۔ نئے کپڑے بدل کر جاؤں کہاں اور بال بناؤں کس کے لئے	۱
۲۸۔ تو ہے دلوں کی روشنی تو ہے سحر کا بانکپن	۱
۲۹۔ گُنج گُنج نغمہ زن بسنت آگئی	۱
۳۰۔ غم ہے یا خوشی ہے تو	۱
۳۱۔ دیس سبز جھیلوں کا	۱
۳۲۔ گئے دنوں کا سراغ لے کر کدھر سے آیا کدھر گیا وہ	۱
۳۳۔ وہ ساحلوں پہ گانے والے کیا ہوئے	۱

"پہلی بارش" کی بحران سب سے مختلف ہے:

۳۴۔ میں نے جب لکھنا سیکھا تھا۔ یہ "ختم ہوا تاروں کا راگ" سے صرف ایک رکن کے اضافے کی وجہ سے مختلف ہے۔ یوں ثابت ہوا کہ ناصر نے تقریباً ۳۴ مختلف لہجے اپنائے۔ ان میں چھوٹی بحروں کی تعداد بہت ہے لیکن ناصر نے لمبی بحریں بھی استعمال کیں اور ان میں اچھی غزلیں کہیں۔ یہی لہجوں کا تنوع ہے کہ ناصر کی غزلوں کو ظاہر طور پر بھی پُرکشش بنائے رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی امیجری اور لفظیات بھی ہیں۔

ناصر کی امیجری ایک بالکل نئی تازہ پکچر گیلری ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ اس میں نہ صرف مدھم رنگوں کی آمیزش نئی نئی ہیں بلکہ خود تصویریں غزل میں پہلے کی بنائی ہوئی تصویروں سے مختلف ہیں۔ یوں بھی ہر شاعر اپنی ایک الگ امیجری کا مالک ہوتا ہے، اور عموماً امیجری (تمثالیں) ہی شاعر کی پہچان کرواتی ہے۔

"نئے امیجز کی تخلیق کا دار و مدار شاعر کی قوتِ اختراع اور مشاہدے پر ہوتا ہے .... شاعری میں امیجری کا غیر معمولی پن اور تازگی اس کی عظمت کا معیار نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد تجربے کو مخصوص انداز میں نمایاں کرنا ہے ....

"امیج تخلیقی تجربے کو مماثلت کے ذریعے محاکاتی طریقے سے پیش کرنے کا نام ہے۔ شاعر الفاظ کے ذریعے اپنے تجربات اور جذبات کو متناسب یا مماثلتِ اشیا میں مشخص کر کے امیج کی تخلیق کرتا ہے ...

"........ ایلیٹ کے نزدیک یہ صرف اظہار کی ایک تکنیک ہے۔ ایذرا پاؤنڈ اسے وسیع تر عمل گردانتا ہے اور اس کے نزدیک اس کی غائت ذہنی اور جذباتی کومپلیکس کو پیش کرنا ہے۔ شبلی اسے محاکات سے تعبیر کرتے ہیں۔ امیج کی تشریحوں کی گوناگونی کے باوجود یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا تعلق ادراک اور اظہار دونوں سے ہے۔ تخلیقی عمل میں جب شاعر تجریدی ادراک کی بجائے تصویروں اور مشابہتوں کے ذریعے اپنے تجربے کو گرفت میں لاتا ہے تو نتیجۃً امیج پیدا ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر امیج محسوسات اور تجربات کا تصویری بیان ہے۔" [۱]

"سادہ ترین الفاظ میں شاعرانہ تمثال کی توصیف یوں کی جا سکتی ہے کہ وہ الفاظ کے نقش و نگار سے بنی ہوئی ایک تصویر ہوتی ہے .... جان مڈلٹن مرے کہتا ہے .... 'انسانی طبیعت کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ تمثال میں جو شباہت ہو وہ صداقت پر مبنی ہو اور ایسی مشابہت ہو جس کا ادراک ہمیں پہلے کبھی نہیں ہوا اور جس کا ظہور ہمیں ایک الہامی انکشاف معلوم ہو ....

---

[۱] انیس ناگی۔ "تنقیدِ شعر" (امیجری) ص ۱۱۱ تا ۱۲۰

"وہ قوت جو شاعرانہ تمثالیں پیدا کرتی ہے اور پھر ان کا دوسروں تک ابلاغ کرتی ہے تخلیل ہے...."

"شاعر جو تمثالیں استعمال کرتا ہے وہ اس کے تمام وکل تجربۂ زندگی سے ماخوذ ہوتی ہیں۔ ان کی کامیابی کا معیار یہ ہے کہ وہ پڑھنے والے کے ذہن پر یہ تاثر چھوڑیں کہ وہ مضمون کی قدرتی زبان ہیں، یعنی مضمون نے خود بخود ان کو انتخاب کیا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ بغیر کسی محنت کے شاعر کو خود بخود سوجھ گئی تھیں....."

"شاعرانہ تمثالوں سے ہمیں وہی مسرت حاصل ہوتی ہے جو کسی بھولی ہوئی بات کے یکایک یاد آجانے سے یا کسی ہمدمِ دیرینہ کے مدتوں بعد ملنے سے حاصل ہوتی ہے۔ ہمیں یوں لگتا ہے کہ بقول ییٹس ہم کسی اور کے قالب میں نئے سرے سے جنم لے رہے ہیں، ہم اپنے ہم جنسوں کے مجموعی تجربات میں شریک ہو کر ان کے ساتھ ایک رشتہ" وحدت کے احساس سے لذت اندوز ہوتے ہیں"[1]

یوں امیجری شاعری میں ابلاغ کا کام دینے کے علاوہ اس کے حُسن اور نکھار کا باعث بھی ہوتی ہے اور ناصرؔ کی شاعری میں تو حُسن ہی حُسن ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو اس کے لئے تیار رکھتے کہ خوبصورت تمثالیں ان کی غزل کو خوب توانائی دیتی ہیں۔ نئے اشاروں اور نئی علامتوں نے ان کی غزل کو ایک نئی فضا سے آشنا کیا ہے۔ انہوں نے نئی نسل کی مخصوص اور جذباتی کیفیت کے اظہار کے لئے ان گنت نئے پیکر تراشے ہیں۔ اسی لئے ان کی غزلوں کی امیجری بالکل نئی اور اچھوتی لیکن مانوس معلوم ہوتی ہے۔ احساس کی شدت اور تخیل کی جولانی نے ان کی تشبیہات و استعارات میں کچھ ایسا رنگ دیا ہے جس سے زندگی پھوٹی پڑتی ہے۔ ناصرؔ کی غزل میں تکلف اور بناوٹ کا شائبہ تک نہیں ہوتا، کیونکہ وہ ایک سادہ اور پُرخلوص انسان کے دل سے نکلی ہوئی آواز ہے۔ خلوص اور صداقت اس کا جوہر ہے، سادگی اور صفائی اس کی جان ہے اور اس کی جھلکیاں اس کے اسلوب میں بھی نظر آتی ہیں جو ان کی غزل کی بنیاد ہے۔ برجستگی اور بے ساختگی، شگفتگی اور شادابی،

---

[1] سی۔ ڈے۔ لیوس "مغربی شعریات از محمد ہادی حسین" (شاعرانہ تمثال) ص ۲۴۳ تا ۲۵۲

توازن اور ہم آہنگی اور صفائی سادگی سے ملی جلی رنگینی اور پُرکاری اس اسلوب کی نمایاں ترین خصوصیات ہیں ...... غزل کا ایک ایسا نیا اور اچھوتا انداز اور اسلوب نظر آتا ہے جس سے اس کی روایت اب تک ناآشنا تھی"۔[۱]

ایمیج کی کئی ایک قسمیں ہیں۔ ان میں سے سب سے عام اور نمایاں بصری ایمیج ہے۔ جب شاعر لفظوں کے ذریعے ایسی تصویر مرتب کرے جس کا تعلق بصارت سے ہو اسے بصری ایمیج سے تعبیر کیا جاتا ہے...... سماجی ایمیج میں شاعر الفاظ کے ذریعے ایسا منظر مرتب کرتا ہے جس کا رشتہ بصارت کی بجائے سماعت سے ہوتا ہے" پھر ایک قسم مرکب ایمیج کی بھی ہے۔

ناصر نے جیسا کہ بتایا تھا کہ انھیں ہر فنِ لطیف سے دلچسپی رہی ہے۔ پھر انہوں نے موسیقی بھی سیکھی اور مصوری کو بھی کافی مدت تک اپنایا۔ یوں شاعری جو تقریباً سبھی فنونِ لطیفہ کے رنگ اپنے اندر رکھتی ہے، ناصر کے ہاں مصوری کے حسین شاہکاروں کی عکاس بن گئی۔ یہ تو درست ہے کہ ناصر نے شاعری کو ہمیشہ بطور شاعری ہی اپنایا نہ کہ بطور موسیقی یا مصوری کے لیکن وہ اس کے قائل تو تھے کہ شاعری کی وسیع سلطنت میں موسیقی اور مصوری کو بھی مقام حاصل ہے۔ انہیں یوں بھی مصوری سے بہت دلچسپی تھی۔

سوزان لینگر صنف کے شدھ ہونے کی بڑی قائل ہیں۔ مثلاً یہ کہ موسیقی کو بطور موسیقی اپنانا چاہیئے۔ اس سے شاعری کا کام نہیں لیا جاسکتا۔ اس سے بعضوں نے یہ سمجھا کہ فن کی اصناف کا آپس میں کوئی ربط ہی نہیں ہے۔ حالانکہ اس نے استعارہ، اسم اور ایمیج پر جو بحث کی ہے اس سے صاف نتیجہ یہ مرتب ہوتا ہے کہ فن کی ایک صنف دوسری صنف سے بے تعلق نہیں رہ سکتی۔ میں نے تصویریں دیکھنے سے پہلے How to look at a picture کے

---

[۱] ڈاکٹر عبادت بریلوی "جدید شاعری" (ناصر کاظمی اور برگ نے) ص ۵۱۲ - ۵۱۵

قسم کے نسخے نہیں پڑھے۔ تصویریں دیکھنا مجھے انیس نے سکھایا۔

؎ نکلے خیمے سے جو لے کر علی اصغر کو حسین

مرثیہ شروع ہوتے ہی سننے والا کربلا کے میدان میں پہنچ جاتا ہے۔" ؎

اب سب سے پہلے ہم ناصرؔ کی بصری تمثالوں کو دیکھتے ہیں۔ بصری امیجری میں بھی دو طرح کی تصویریں بنتی ہیں ساکن حرکی۔ ناصرؔ کی ساکن تمثالیں اس طرح کی ہیں:

"بام و در خاموش"، "چپ چاپ طیور"، "بے خواب دریچہ"، "سنسان گلی"، "رستے کہکشانی" (دیوان) "میتِ شہرِ بے کفن"، "بستی چین سے سو رہی ہے"، "یہ شہر چھپ کے رات کو سوتا ہے آب میں"، "بجھے دنوں کا ڈھیر" (برگ نے) "لپٹ کے سو رہو زنجیرِ در سے"، "اداسی بال کھولے سو رہی ہے"، "یادوں کے بجھے ہوئے سویرے"، "برگ گل کی چھاؤں"، "صنم خانۂ گل"، "دھیان کی سیڑھیاں"، "پھولوں کے خزانے"، "جسم چاندنی کا شہر ہے"، "سنسان آسماں، چپ کھڑے مکاں"، "سو رہا تھا یاد کے شبستاں میں"، "انگشتِ حنائی"، "شبِ خزاں کی خنک چاندنی کا نظارہ"، "شہرِ گل"، "بجھا بجھا سا ایک دیا"، "سوکھ گئے بہتے دریا"، "چاند میں سو گئی چاندنی"، "کھڑی ہے در پہ میرے سر جھکائے شامِ فراق" اور

ٹھنڈی دھوپ کی چھتری تانے　　پیڑ کے پیچھے پیڑ کھڑا تھا

چاند بھی پتھر جھیل بھی پتھر　　پانی بھی پتھر لگتا تھا　　(پہلی بارش)

اب ناصرؔ کی حرکی تمثالیں دیکھیں جو نہ صرف خود حسین ہیں بلکہ زندگی کی چہل پہل کے حسن کو بھی ظاہر کرتی ہیں (دیوان) "کرن پریاں اترتی تھیں"، "دیوار سی گری ہے"، "دور کھڑے خالی ہاتھ ہلاتے ہیں"، "پتوں کا میلہ"، "ناؤ چل رہی ہے"، "آگ جل رہی ہے"، "پھولوں کی ڈالی"، "ہاتھ مل رہی ہے"، "ابر اٹھا ہے جھوم کر"، "لگی ہے آگ کنارے پر"، "چلتا دیا"، "تیز لون"، "نیندیں بھٹکتی پھرتی ہیں"، "آگ سی لگ گئی درختوں میں"، "دیا جلتا رہا ہے"، "سایہ ہے میرا ہم سفر"، "نیند اڑا کر اڑ گئی چڑیا"، "دکھ کی لہر

؎ ناصر کاظمی۔ رسالہ "سویرا"، ۔ ۸ (نیا اصم) مئی ۔ ۹۹

"بیتے لمحوں کی جھانجن" "بارشیں تیروں کی" "سفینے چلنے لگے یاد کے سرابوں میں" "مثالِ گردِ سفر گیا وہ" (برگِ نے) اُڑ گئے شاخوں سے طیور" "قافلہ بگولوں کا" "پاؤں چلنے لگی جلتی ہوئی ریت" "دشت سے جب کوئی آہو نکلا" "بگولے اُڑتے پھرتے ہیں خشک جنگل میں" "تلاشِ آب میں غزالِ آوارہ" "درد کی طغیانیاں" "وا ہوا در میخانۂ گل" "رقص کرتی ہوئی شبنم کی پری" "کوئی چپکے سے پاؤں دھرتا ہے" "ہرا دائے روانِ آب کی لہر ہے" "جگا کے چھوڑ گئے قافلے سحر کے مجھے" "محرومِ خواب دیدۂ حیران" "اشکوں میں ڈھل گئی تری صورت کبھی کبھی" "دن کا سنہرا نغمہ سُن کر ۔ ابلقِ شب نے موڑی باگ"

دن کا پھول ابھی جاگا تھا
دھوپ کا ہاتھ بڑھا آتا تھا (پہلی بارش)

حسِ بصارت کی کچھ اور تمثالیں: "کہیں کہیں کوئی روشنی ہے" "در و دیوار ویراں شمعِ مدھم" "چراغوں کا دھواں" "وہ ستارہ تھی کہ شبنم تھی کہ پھول" "یک بیک آ کے دکھا دو جھمکی" "لہلہائیں گی پھر کھیتیاں کارواں کارواں" "دیس سبز جھیلوں کا"۔

ناصر کے ہاں حسِ سامعہ کی تمثالیں آواز کو بھی جسم و جاں دے جاتی ہیں "پھر کوئی نغمہ گلو گیر ہوا" "پھر پتوں کی پازیب بجی" "کوئی نامانوس اُداس نوا کچھ کہتی ہے" "مجھ سے باتیں کرتی ہے خاموش تصویروں کی" "پیاسی کرلاتی کونجیں" "ہر شے پکارتی ہے پسِ پردۂ سکوت" "آہ بھی نغمہ بنا چاہتی ہے" "شور برپا ہے خانۂ دل میں ۔ کوئی دیوار سی گری ہے ابھی" "ریل کی گہری سیٹی سن کر ۔ رات کا جنگل گونجا ہوگا" "چہکتے بولتے شہروں کو کیا ہوا ناصر" "بیتے لمحوں کی جھانجن" "خوشی انگلیاں چٹخا رہی ہے" "دل کی دھڑکن کہتی ہے" "سناٹوں میں سنتے ہیں سُنی سنائی کوئی بات" "میٹھی بولی میں پپیہے بولے ۔ گنگناتا ہوا جب تو نکلا" "گھنٹیوں کی صدا سو گئی" "پھر زور سے قہقہہ لگاؤ" اور یہ غزل تو ساری کی ساری اسی ذیل میں آتی ہے:

سازِ ہستی کی صدا غور سے سُن
کیوں ہے یہ شور بپا غور سے سُن

ناصر کے ہاں خوشبوئیں بھی اپنی جھلک ضرور دکھاتی ہیں۔ "خوشبوؤں کی اُداس شہزادی" "جھکی ہوئی سانسیں" "لے اُڑی سبزۂ خودرو کی مہک" "لئے پھرتی ہے کوئی باس اُداس" "رستوں میں اُداس خوشبوؤں کے ۔ پھولوں نے لٹا دیے خزانے" "کوئی آوارہ مہک یاد آئی" "اجنبی مہک پاکر ہم نکل پڑے گھر سے"۔ کچھ تمثالیں مفرد ہوتی ہیں اور کچھ مرکب۔ مفرد تمثالوں میں ایک حس کی تصویر بنتی ہے جبکہ مرکب میں دو یا دو سے زیادہ حسوں کی نمائندگی ہوتی ہے۔ ناصر کی مرکب تمثالیں کچھ اس طرح کی ہیں: حسِ سامعہ۔ حسِ بصارت۔ "سُن کے طاؤس رنگ کی جھنکار" "دن کا سنہرا نغمہ سن کر" "پردۂ گل ہی سے شاید کوئی آواز آئے" "بسا ہوا ہے خیالوں میں کوئی پیکرِ ناز۔ بُلا رہی ہے ابھی تک وہ دلنشیں آواز" "کسی کلی نے بھی دیکھا نہ آنکھ بھر کے مجھے۔ گزر گئی جرسِ گُل اداس کرکے مجھے" "رنگ صبحوں کے راگ شاموں کے" "زمزمہ ریز ہوئے اہلِ چمن" "دل میں اک عمر جس نے شور کیا۔ وہ بہت کم رہا ہے آنکھوں میں" "چیختی ہیں ڈراؤنی راتیں۔ چاند نکلا ہے آسمان سے دور" "پھر درد نے آگ راگ چھیڑا" "سُن کے آوازہ" "زنجیرِ صبا" "اک صدا سنگ میں تڑپی ہوگی" "دیکھ کر آئینۂ آبِ رواں۔ پتہ پتہ لب گویا ہوگا" "دن کا چراغ نکلا گُل ہو گئے ستارے۔ دنیا کے شور و غل میں دل اب کسے پکارے" "ریگِ رواں کی نرم تہوں کو چھیڑتی ہے جب کوئی ہوا۔ سُونے صحرا چیخ اُٹھتے ہیں۔ آدھی آدھی راتوں کو" "کیسے سنسان ہیں آسماں، چپ کھڑے ہیں مکاں" "پھر سرِ شام کوئی شعلہ نوا۔ سو گیا چھیڑ کے افسانۂ گُل" "سن شگفتگیِ غنچہ کی صدا" "گُل ریز میری نالہ کشی سے ہے شاخ شاخ" "پھر کونجیں بولیں گھاس کے ہرے سمندر میں" "سُناتا ہے کوئی بھولی کہانی۔ مہکتے میٹھے دریاؤں کا پانی" "دف بجائیں گے برگ و شجر صف بہ صف ہر طرف" "نیلی دھندلی خاموشی ہیں" "چلتا دریا، ڈھلتی رات۔ سن سن کرتی تیز ہون" "جلوۂ رنگ بھی ہے اک آواز" "بس ایک موتی سی چھب دکھا کر بس ایک میٹھی سی دُھن سنا کر"۔

تین حسوں کی مرکب تمثالیں دیکھیے۔ حسِ بصارت۔ حسِ سامعہ۔ حسِ شامہ۔

"وہ بوئے گل تھا کہ نغمۂ جاں" اور

پون چلی. تو گُل و برگ دَف بجانے لگے
اُداس خوشبوئیں لودے اُٹھیں نقابوں میں

لمس کی حس اور حسِ سامعہ سے مل کر جو تمثالیں بنی ہیں وہ یوں ہیں۔ "گرم اے صرصرِ آلامِ دوراں۔ دلوں کی آگ بجھتی جارہی ہے" "ہوائے صبح نے چونکا دیا یوں۔ تری آواز جیسے دل سے گزری" لمس کی اس امیجری کا احساس پڑھنے والے کو کپکپا دیتا ہے:

ہاتھ ابھی تک کانپ رہے ہیں وہ پانی کتنا ٹھنڈا تھا

ناصرؔ زرد رنگ کا بہت ذکر کرتے ہیں۔ کہیں سبز، لال اور نیلا رنگ بھی جھلک جاتا ہے۔ ناصرؔ کی لفظیات میرؔ سے تھوڑی بہت مماثل ہونے کی باوجود اپنی ایک پُر قوت انفرادیت ضرور رکھتی ہے۔
" ناصرؔ کی شاعری مخصوص لفظیات کی حامل ہے۔ ان کے یہاں دریا، چشمہ، بستی، بگولے، طیور، قافلہ منزل، صحرا، جنگل، شہر، چاند، صبحِ طرب، شہرِ طرب، جادو، گُل، خوشبو، شہرِ گل، رفتگاں، جرس، نگری، بسیرا جیسے الفاظ نہ صرف یہ کہ بار بار استعمال ہوئے ہیں بلکہ نئے معنی اور خاص پس منظر میں استعمال ہوئے ہیں[۱]" "ناصر کاظمی نے نئے استعاروں سے بھی کام لیا ہے اور بعض اوقات جہاں الحانِ غزل کو وہ اپنی آواز کی لرزش دینے میں کامیاب ہوئے ہیں، ان کی غزل تازہ نوائی اور نئے فنی استغراق کا پتہ دیتی ہے ...... اگرچہ اپنے فن کی جمالیاتی تشکیل میں وہ ابھی تک منہمک ہیں اور ابھی ان کی شاعری تراش و تراوش کے مدارج طے کر رہی ہے لیکن اس کوشش میں بھی وہ ہمیں غزل کی نئی سمتوں سے آشنا کرتے ہیں[۲]"

لفظ خود ناصرؔ کو بے حد عزیز ہیں اس لیے کہ انھیں معلوم تھا کہ اس فنِ لطیف کے اظہار کے لیے الفاظ کی خوبصورتیاں ہی استعمال ہوتی ہیں۔ "میں نے تو لفظوں اور حرفوں کی قوسوں میں جان

---

[۱] نظیر صدیقی "فنون" جدید غزل نمبر ۶۹ء (جدید غزل۔ پاکستان اور ہندوستان میں)

[۲] ڈاکٹر حنیف فوق "فنون" جدید غزل ۶۹ء (اردو غزل کے نئے زاویے)

بھی محسوس کی ہے اور ان کے پیچ و خم کی فریاد بھی سنی ہے۔ یہ حرف "ب" خیمے کا اسم تھا۔ خیر یہ تو لمبا قصہ ہے، ایک شعر سن لو:

اٹھاتا ہوں جب طاق سے میر صاحب کا دیوان

ورق بولتے ہیں کہ لفظوں کی توسوں میں جان ہے" [1]

" جس نے لفظ ایجاد کیا وہ پہلا شاعر تھا، اور افسانہ نگار بھی شروع میں سب لفظ شعر اور افسانے تھے۔ بنیوں نے شاعروں اور افسانہ نگاروں پر غار کھایا اور ان شعروں اور افسانوں سے کاروباری کام شروع کر دیئے اب زبان ایک سماجی ضرورت کی تکمیل کا وسیلہ ہے۔ شاعری اور افسانہ نگاری اب یہ ٹھہری کہ ان لفظوں کے نیچے دبے ہوئے افسانوں اور شعروں کو باہر لایا جائے"۔ [2]

ناصر کے ہاں لفظ موسیقی کے نرم سُروں کے اُتار چڑھاؤ کا ساتھ دیتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ نرم صوتوں کے استعمال سے ان کی غزل آہستہ آہستہ دل میں سماتی جاتی ہے۔ وہ لفظوں کی تکرار سے بھی موسیقی کا حسن قائم کر لیتے ہیں اور حرفوں کی صوتی خوبصورتی سے وہ بے خبر نہ تھے۔ ناصر نے ایسی کتابوں کا مطالعہ بھی کر رکھا تھا جو الفاظ و اصوات پر لکھی گئی تھیں۔ ناصر کے پسندیدہ حرف "ش" "ل" "ن غنہ" "ب" "م" اور "ی" وغیرہ یعنی وہ نرم اصوات، نرم سُروں کو اپناتے تھے۔

آخر میں "برگ نے" کی ایک غزل (دن ڈھلا رات پھر آ گئی سو رہو سو رہو) اور "دیوان" کی ایک غزل (رہ نوردِ بیابانِ غم صبر کر صبر کر) کو آمنے سامنے رکھ کر انہیں عکس در عکس دیکھنا دلچسپ رہے گا۔ ان دو غزلوں کو چننے کی کچھ وجوہ ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ یہ دونوں غزلیں ایک ہی بحر میں ہیں اور ناصر نے کوئی اور غزل اس بحر میں نہیں کہی۔ پھر ان کی ردیفوں میں بھی ایک مماثلت ہے، اور

---

[1] ناصر کاظمی "سویرا" ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱ (ایک مکالمہ "رفتار کا بدن") ص ۴۹۴

[2] ناصر کاظمی "نیا دور" ۷۔۸ (نیا اسم) ص ۱۰۰

سب سے اہم بات یہ ہے کہ بعد کی غزل پہلی غزل کی کچھ باتوں کی وضاحت کرتی ہوئی، کچھ سوالوں کے جواب دیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس پرکھ سے ناصر کے فکروفن میں ارتقائی صورت بھی ظاہر ہوگی۔

یہ دونوں غزلیں بہت خوبصورت ہیں۔ "برگِ نے" کی غزل میں رات کا گہرا مشاہدہ ہے۔ پھر اس ساری غزل میں نرمی ہے، ایسی نرمی جو دھیمی پڑتی ہوئی بالکل گُم ہوتی، سو جاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور "دیوان" کی غزل نیند سے ابھی ابھی چونک کر اُٹھ بیٹھنے کے بعد اِرد گرد کی فضا کو پہچاننے اور پھر اپنے آپ کو اس کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کی کوشش معلوم ہوتی ہے۔ "برگِ نے" والی غزل میں ناصر سو رہنے کو ہی زیادہ مناسب سمجھتے ہوئے اس کا مشورہ دیتے ہیں۔ کبھی موسم کی خوبصورتی اور غنودگی کا بہلاوا دے کر اور کبھی مایوسی کی شناخت کروا کے سونے پر مجبور کراتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ لیکن "دیوان" کی غزل میں جیسے وہ خود سونے والوں کو آہستگی سے جگا کر انھیں سمجھا رہے ہیں کہ "صبحِ روشن" آنے میں کچھ ہی دیر ہے بس ع اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں۔ وہ مکمل طور پر ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ رہنے والے صبر کی تلقین نہیں کر رہے بلکہ صبر کے ایک عارضی وقفے کی تھپکی دے رہے ہیں۔ دراصل "دیوان" کی غزل کی آمد کی اطلاع "برگِ نے" کی یہ غزل دے چکی تھی۔ یہاں میں اشعار اس ترتیب سے درج کروں گی جس ترتیب سے ایک شعر کی کشش نے دوسرے شعر کو اپنی جانب کھینچا ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ دو انسان بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ ایک "برگِ نے" کا مایوس واداس ناصر ہے اور دوسرا "دیوان" کا پُراعتماد اور پُرامید ناصر۔ آیئے ان دوستوں کی گفتگو سنیں:

دیوان	برگِ نے
رہ نوردِ بیابانِ غم صبر کر صبر کر	دن ڈھلا رات پھر آگئی سو رہو سو رہو
کارواں پھر ملیں گے بہم صبر کر صبر کر	منزلوں چھا گئی خامشی سو رہو سو رہو

برگِ نے

گرم سنسان قریوں کی دھرتی تپکنے لگی
خاکِ رشکِ ارم بن گئی سو رہو سو رہو

کیسے سنسان ہیں آسماں چپ کھڑے ہیں مکاں
ہے فضا اجنبی اجنبی سو رہو سو رہو

تھک گئے ناقہ و سارباں تھم گئے کارواں
گھنٹیوں کی صدا سو گئی سو رہو سو رہو

گردشِ وقت کی لوریاں رات کی رات ہیں
پھر کہاں یہ ہوا یہ نمی سو رہو سو رہو

گھر کے دیوار و در راہ تک تک کے شل ہو گئے
اب نہ آئے گا شاید کوئی سو رہو سو رہو

سست رفتار تارے بھی آنکھیں جھپکنے لگے
غم کے مارو گھڑی دو گھڑی سو رہو سو رہو

منہ اندھیرے ہی ناصر کسے ڈھونڈنے چل دیے
دور ہے صبحِ روشن ابھی سو رہو سو رہو

دیوان

بے نشاں ہے سفر رات ساری پڑی ہے مگر
آ رہی ہے صدا دم بدم صبر کر صبر کر

تیری فریاد گونجے گی دھرتی سے آکاش تک
کوئی دن اور سہہ لے ستم صبر کر صبر کر

یہ محلات شاہی تباہی کے ہیں منتظر!
گرنے والے ہیں ان کے علم صبر کر صبر کر

دف بجائیں گے برگ و شجر صف بہ صف ہر طرف
خشک مٹی سے پھوٹے گا نم صبر کر صبر کر

پہلے کھل جائے دل کا کنول پھر لکھیں گے غزل
کوئی دم اے صریرِ قلم صبر کر صبر کر

درد کے تار ملنے تو دے ہونٹ ہلنے تو دے
ساری باتیں کریں گے رقم صبر کر صبر کر

دیکھ ناصر زمانے میں کوئی کسی کا نہیں!
بھول جا اس کے قول و قسم صبر کر صبر کر

اور آخری بات :

لہلہائیں گی پھر کھیتیاں کارواں کارواں
کھل کے برسے گا ابرِ کرم صبر کر صبر کر

پانچواں باب

ناصر کی نظم اور نثر کا جائزہ

(۱) نظم

اصل بات یہ ہے کہ ناصر کاظمی کا مزاج غزل گوئی کے لیے ہی مناسب ترین تھا۔ بے شک تخیل، فکر، جذبہ و احساس کے شاعرانہ اظہار پر غزل، نظم یا نثر کی قید نہیں لگائی جا سکتی لیکن انسان ایک کائنات ہوتے ہوئے بھی ایک اور وسیع تر کائنات کا ننھا سا نقطہ بھی ہے۔ یوں وہ اپنے بازوؤں کی وسعت میں بہت کچھ سمیٹ تو سکتا ہے لیکن اس بہت کچھ میں سے ہر ایک کی مناسب حفاظت کا حق ادا کر سکنا، ہر ایک کے لیے ممکن نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ناصر اگر نظم گوئی پر بہت توجہ دیتے تو اس صنف میں بھی ایک نئی، بالکل الگ سی نظم کو تخلیق کر دیتے، لیکن جب غزل ہی ان کے تخلیقی جذبے کی مکمل تسکین کر رہی تھی تو وہ کسی اور صنف کو منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے ہی اپناتے تھے۔ دراصل انھیں یہ کہنے کی ضرورت ہی نہ ہوئی کہ:

بقدرِ شوق نہیں، ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت، مرے بیاں کے لیے (غالبؔ)

اس لیے کہ ایک تو ان تک آتے آتے غزل تنگنا‌ؤں سے نکل آئی تھی۔ پھر انھوں نے خود بھی اس میں اتنی وسعتیں تو بھر دی تھیں کہ جو کچھ بھی انھیں کہنا تھا وہ کہہ سکتے تھے حتیٰ کہ وہ تو یوں بھی سوچنے لگے تھے:

"یار کبھی کبھی تو چاند بھی مجھے پیاز کا ایک پرت نظر آتا ہے۔ میں دھیان کی انگلیوں سے رات اس کے پرت اتارتا رہا۔ لیکن یہ چاندی کا پیاز ختم ہونے ہی میں نہیں آتا۔ کبھی کبھی پیاز

کی گٹھی کو دیکھ کر یوں گمان گزرتا ہے جیسے چاند اتر آیا۔ غزل گوئی میں خرابی یہی ہے کہ وہاں پیاز کا ذکر نہیں کیا جا سکتا۔ ویسے یہ کام اب کرنا ہی پڑے گا۔[1] تو جب صورتِ حال یہ ہو کہ پیاز تک کو غزل میں سجانے کی خواہش اور ارادہ ہو تو پھر بھلا نظیر اکبر آبادی بننا ضروری ہے۔ ویسے ناصر نے نظمیں بھی کہی ہیں۔ شروع میں تو وہ میر تقی میر کی طرز پر "شہر آشوب" اور "عالمِ خواب میں" (رسالہ "عالمگیر" خاص نمبر ۱۹۴۹ء جنوری - فروری) لکھیں۔ پھر جدید اردو نظم میں بھی تجربے کیے لیکن حق بات یہ ہے کہ ان کی غزل ان کی نظم سے کہیں زیادہ آگے ہے۔ بلکہ ان کی غزل میں اتنی بہت سی قوت ہے کہ وہ ان کی نظموں کو سامنے ہی نہیں آنے دیتی۔ یوں بھی ان کی سبھی نظموں میں سے جو میری نظر سے گزریں، کوئی ایک نظم بھی ایک حسین اور مکمل نظم نہیں کہلا سکتی۔ ان نظموں کے بعض ٹکڑے بے شک قابلِ داد ہیں لیکن ان کی نظمیں خود اپنے قدموں پر کھڑی رہ ہی نہیں سکتیں۔ انہیں سہارے دینا پڑے ہیں۔ ہاں ان کی کچھ غزلیں ایسی ہیں جو ایک نظم کی سی وحدتِ تاثر لیے ہوئے ہیں۔ ان کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔ شاعری کی صنف نظم کے ارتقاء کو آگے بڑھانے یا کم از کم اس کا ساتھ دینے میں ان کا حصہ نہیں بنتا۔ ہاں غزل کے تو واقعی وہ اپنے دور کے بادشاہ بھی رہ چکے ہیں، خضر بھی اور مسیحا بھی۔ یوں بھی ناصر کی نظموں میں غزل کے اشعار اور خوبصورت مصرعے شامل ہیں۔ ہر صنفِ سخن اپنے کچھ تقاضے رکھتی ہے اور صنفِ نظم کے بھی کچھ تقاضے ہیں۔

اختر الایمان .... نظم کی بنیادی صفت اس کا تعمیری پہلو ہے۔ ہر نظم اپنی جگہ پر ایک عمارت ہوتی ہے۔ جس طرح کسی عمارت میں ایک اینٹ اپنی جگہ پر کوئی حیثیت نہیں رکھتی اس طرح نظم کا ایک مصرع یا ایک شعر اپنی جگہ پر علیحدہ سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا، البتہ مبہم سا انسپریشن ہوتا ہے جو سب سے پہلے شاعر کے ذہن میں ایک مصرع یا ایک شعر کی شکل میں آتا ہے۔ بقیہ نظم دراصل اس کی تشریح کے لیے یا اس کا پس منظر تیار کرنے کے لیے کہی جاتی ہے......

---

[1] ناصر کاظمی "سویرا" ۱۷۔۱۸ (ایک مکالمہ۔ خوشبو کی ہجرت) ص ۲۱۸

"منیب الرحمٰن . . . . . . نظم میں ابتدا یا اٹھان، کلائمکس اور پھر مجموعی تاثر کا خیال رکھنا چاہیے ہمارے یہاں Images غزل میں بھی ہوتی ہیں، لیکن نظم میں اس کے استعمال میں سلیقے کی ضرورت ہے، کیونکہ جلد از جلد امیجز بدلنے سے نظم کے تاثر پر اثر پڑتا ہے . . . . . ."

"آل احمد سرور . . . . . . پیکر کی تخلیق بھی شاعرانہ عمل ہے۔ کسی روح کو جب تک پیکر میں نہ ڈھالا جائے گا شاعرانہ عمل مکمل ہی نہ ہوگا، اور نہ شاعر اس وقت تک خالق کہا جا سکتا ہے۔ اردو میں حالیؔ سے پہلے بھی نظمیں لکھی گئیں، لیکن عرصے تک ہماری نظم پر بھی غزل کا سایہ رہا ہے اس کے اثرات اب بھی باقی ہیں . . . . . . غزل کا مزاج رکھنے والوں کے یہاں مسلسل پرواز نہیں ملتی۔ وہ ایک مخصوص طرزِ فکر کے خوگر ہو جاتے ہیں۔ مربوط اور مسلسل فکر کے بجائے اجزا کے حسن پر فریفتہ ہوتے ہیں . . . . . . مسلسل روشنی کے لیے مسلسل پرواز کی ضرورت ہے، پرواز یا بصیرت کی ضرورت ہے۔ ہلکی سی کسک یا ہلکی سی لہر کافی نہیں۔ نظم کی مثال ایک دریا کی سی ہے، جس میں طرح طرح کے نشیب و فراز نہیں۔ وہ چٹانوں کا سینہ چیر کر نکلتا ہے تو کہیں میدانوں میں متانت اور وقار کے ساتھ بہتا ہے لیکن دریا میں ایک تسلسل اور ایک وحدت ہوتی ہے . . . . . ."

"خورشید الاسلام . . . . . . زندگی کے مختلف تجربات و مشاہدات اور جذبات و احساسات کو پیش کرنے کے عام طور پر تین طریقے ہیں۔ پہلا، ردِ عمل کی پیش کش۔ اسے غزل کہتے ہیں۔ محسوسات کو ایمانداری، تازگی، اختصار اور ایجاز کے ساتھ پیش کرنا۔ ذاتی ردِ عمل، ذاتی بصیرت اور ذاتی تجربے کے انکشاف میں کم سے کم تفصیلات کی ضرورت ہے۔ دوسرا طریقہ وہ ہے جو ڈراما میں ہوتا ہے۔ اس میں زندگی کی کشمکش ہوتی ہے۔ اقدار کا تصادم، خیر و شر یا حسن و قبح کا معرکہ ہوتا ہے اس کی پیش کش میں ذاتی ردِ عمل کافی نہیں۔ سمبل یا کرداروں کے ذریعے، بے لوثی، معروضیت اور بے تعلقی کے ساتھ پیش کرنا ہوتا ہے۔ تیسرا طریقہ ناول کا ہے۔ ناول نگار کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ماحول کی تفصیلات و جزئیات بیان کرکے مصوری سے بھی کام لے اور عمل کو بھی جگہ دے۔ نظم میں یہ تینوں باتیں ممکن ہیں۔ ذاتی ردِ عمل کا انکشاف محض عمل کے ذریعے اور بے لوثی کے ساتھ یا عمل اور بیان دونوں

کے ساتھ تجربے پیش کرنا نظم میں ممکن ہوسکتا ہے۔"

"مجنوں گورکھپوری ...... نظم دراصل وہی صحیح معنوں میں نظم کہلانے کی مستحق ہوگی جس میں بالیدگی ہو، ابتداء، اوسط اور انتہا ہو اور ہر جُز اس طرح کُل میں ختم ہو جائے کہ کہیں سے جھول نہ معلوم ہو .... (نظم میں) ہر مصرعہ ایک دوسرے سے مربُوط ہوتا ہے، اور اس طرح کہ ان کی نشست یا ترتیب بھی بدلی نہ جا سکے۔ تب نظم کی تعمیر مکمل ہوگی۔ نظم کے پہلے مصرع سے ہمیں یہ احساس ہونا چاہئے کہ جیسے ایک لپٹی ہوئی چیز کو کھولا جا رہا ہے۔ بغیر بالیدگی اور ارتقاء کے، نظم، نظم نہیں۔ پہلے شعر کے بعد دوسرا شعر پڑھا جائے تو پہلے شعر کی یاد تو رہ جائے لیکن دوسرا شعر ذہن کو آگے بڑھائے۔"[1]

یہ مختلف آرا نظم کی ہیئت اور تشکیل پر دی گئی ہیں۔ اب ہمیں ناصر کی نظموں کو دیکھنا ہے۔

ناصر نے بہت کم نظمیں کہی ہیں وہ بھی اپنی شاعری کے شروع زمانے میں۔ لیکن ناصر نے اپنی نظمیں اپنے مجموعوں میں شامل نہیں کیں۔ اس لیے یہ صحیح طور سے معلوم نہیں ہو سکا کہ انھوں نے کتنی نظمیں کہیں بہر حال مجھے رسالوں سے اور ان کے گھر والوں سے جو نظمیں دستیاب ہوسکیں، انھیں کو دیکھ کر ایک رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ ناصر کے مزاج کی رومانویت ان نظموں میں بھی جھلکتی ہے۔ وہی رات کی خاموشی، دھندلی فضاؤں میں حرکت کرتے ہوئے پُراسرار ہیولے۔ ان نظموں کی سب سے بڑی خصوصیت ہی یہی ہے کہ یکایک پُراسرار ماحول میں لے جاتی ہیں، جہاں خوفناک چیزیں ہیں اور عجیب و غریب سوچیں رکھنے والے انسان۔ ان نظموں پر مشہور انگریزی رومانی شاعر کولرج کی Super Naturalism کا کافی اثر معلوم ہوتا ہے۔

نظم میں دراصل وضاحت طلب باتوں کا بیان کیا جاتا ہے، یا ایک ہی بات کی جزئیات اور تفصیل بتائی جاتی ہیں، جبکہ ناصر تو چند الفاظ میں پورے افسانے سمو دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

کشتیوں کی لاشوں پر   جمگھٹا ہے چیلوں کا

---

[1] ایک مباحثہ۔ رسالہ "سوغات" جدید نظم نمبر ۷ - ۸ ص ۱۸۷ تا ۱۹۲

اس بستی سے آتی ہیں آوازیں زنجیروں کی

پھر یوں بھی ناصر نے کبھی کوئی بات واضح طور پر کھل کر بیان نہیں کی۔ ایک مبہم سالب ولہجہ برقرار رکھا۔ یہ بات تو خیر نظم کی راہ میں حائل نہیں لیکن ناصر جو مختصر لیکن مکمل جملے کہنا پسند کرتے ہیں، ان کی عادت تو یہ تھی کہ وہ کسی سمت اشارا کر دیتے، اب پہچان اور وضاحت کا کام پڑھنے سننے والوں کے سر د ہے۔ یوں تو پہچان کا کام بہت دلچسپ اور پُر لطف ہوتا ہے لیکن سمت کا تعین صحیح ہو تو تب غزل کے لئے ایمائیت بہت مفید ہے، جبکہ نظم کے لئے اتنی موزوں نہیں۔ اس لئے کہ بات کا فوری ابلاغ ہوتا جائے گا تو تب اس کا اثر بھی ہوگا، اور بات آگے بڑھے گی۔

ناصر نے نظمیں لکھی ضرور ہیں لیکن وہ مقبولیت حاصل نہ کر سکیں۔ دراصل ان میں وہ شاعر ناصر چھا نکتا نظر نہیں آتا جو غزل میں اپنے سچے تجربے اور خلوص کا اظہار کرتا ہے۔ ان کی نظموں میں ان کے اپنے دل سے اٹھنے والی لہروں کی موسیقی بہت کم سنائی دیتی ہے۔ پھر بھی ہمیں ناصر کی فنی شخصیت کے اس پہلو پر ایک نظر ڈال لینی چاہیئے کہ ان کے اس رخ پر بھی کہیں کہیں حسن اور خوبصورتی کے کوندے لپک جاتے ہیں۔

سب سے پہلے ہم ان کی طویل نظموں کا جائزہ لیتے ہیں۔ ان کی طویل نظمیں جو اس وقت میرے سامنے ہیں وہ یہ ہیں ۱۔ "نشاطِ خواب" ۲۔ "نیا سفر" ۳۔ "شہرِ غریب" اور ایک منظوم ڈرامہ ۴۔ "سُر کی چھایا"۔

ان سبھی نظموں سے ناصر کی قادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف لفظوں کا خوبصورت استعمال کرتے ہیں، بلکہ کتنے ہی لفظوں کو نیا پن دے کر انھیں تازہ دم کرتے جاتے ہیں۔ پھر خوبصورت تشبیہیں بھی ہیں اور کہیں کہیں حسین اور نازک خیال بھی۔

"نشاطِ خواب" پر قدیم داستانوں کا اثر صاف ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے شروع میں ناصر خوف کا تاثر قائم کرنے میں خاصے کامیاب رہے ہیں۔

پہنچے تھے ہم بھی رات وہاں مدتوں کے بعد
رستہ تھا ہولناک فضا تھی ڈراؤنی

سناٹوں میں رات کے اٹھتے نہ تھے قدم
پردے میں دل کا وہم بھی کرتا تھا رہزنی

ہوتا تھا کنگروں پہ گماں چشمِ شیر کا
جب دفعتہً فلک پہ دمکتی تھی ڈامنی

کوسوں اکھڑ گیا ہے وہ طبقہ زمین کا
بجلی نے کی ہے رات جہاں کوہ افگنی

لیکن اس خوف کا جواز کیا ہے؟ صرف یہ کہ خواب ہے؟ لیکن شاعروں کے خوابوں کے بھی تو بڑے گہرے معنی ہوتے ہیں۔ خواب میں اچانک منظر بدل جاتا ہے:

تھا اک عجیب شہر درختوں کی اوٹ میں
اب تک ہے یاد اس کی جگا جوت چاندنی

سچ مچ کا اک مکان پرستاں کہیں جسے
رہتی تھی اس میں ایک پری زاد پدمنی

پھر وہ اس محل کے اندر کی تفصیل بتانے کے بعد کہتے ہیں:

کل رات اس پری کی عروسی کا جشن تھا
دیکھی تھی میں نے دور سے بس اس کی روشنی

سراپا کا بیان اس طرح ہے کہ جیسے بت تراشا جا رہا ہو۔ اس میں زندگی کی تازگی نہیں ہے۔ اس لئے کہ:

پلکیں دراز خطِ شعاعی سی تیز تیز
پتلی ہر ایک آنکھ کی ہیرے کی تھی کنی

اور آخر خواب کا انجام یہ ہوا کہ:

اڑ اڑ کے راج ہنسوں نے جنگل جگا دیا
گھوڑوں کی رتھ میں بیٹھ گئے جب بنا بنی

تب شاعر "خواب" سے نکل آیا اور

تارا فجر کا نکلا تو ٹھنڈی ہوا چلی
نیند آگئی مجھے کہ وہاں چھاؤں تھی گھنی

یوں "نشاطِ خواب"، کا مطلعِ اول "نشاط" دینے کا باعث نہیں ہوا۔ البتہ مطلعِ ثانی میں یہ خصوصیت ہے کہ اس کا دوسرا بند ہمیں شاعر کی ذاتی افسردگیوں کی خبر دے جاتا ہے، جس سے ہم بھی متاثر ہوتے ہیں۔

انبالہ ایک شہر تھا سنتے ہیں اب بھی ہے
میں ہوں اسی لٹے ہوئے قریے کی روشنی

اے ساکنانِ خطۂ لاہور دیکھنا
لایا ہوں اس خرابے سے میں لعلِ معدنی

جلتا ہوں داغِ بے وطنی سے مگر کبھی
روشن کرے گی نام مرا سوختہ تنی

خوش رہنے کے ہزار بہانے ہیں دہر میں
میرے ضمیر میں ہے مگر غم کی چاشنی

طویل مثنوی نما نظم "نیا سفر" میں سخنوروں کی داستان یوں بیان کی ہے:

اندھیروں کی نگری سے پھوٹی کرن　　مہکنے لگا حسن کدانِ کُہن
اُٹھا محملِ وقت کا سارباں　　نئی منزلوں کو چلے کارواں
نئے پھول نکلے نئے روپ میں　　زمیں جھم جھمانے لگی دھوپ میں

کہ اچانک:

پہاڑوں سے لاوا نکلنے لگا　　جگر پتھروں کا پگھلنے لگا

اور: زمیں بٹ گئی آسماں بٹ... گیا　　چمن بٹ گیا آشیاں بٹ گیا
پہاڑوں میں، میداں میں، جنگل میں آگ　　سمندر میں، خشکی میں، جل تھل میں آگ
پرانی بہاریں قفس میں گئیں　　وہ انساں گئے اور وہ رسمیں گئیں
پھر: نئی گردشوں میں گھرا آسماں　　زمینِ کُہن پر گرا آسماں
ہُوا ایک جنگل میں آکر گزر　　کسو کو نہیں یاں کسو کی خبر
بھٹکتا رہا اور روتا رہا　　بھرے شہر کی نیند کھوتا رہا
نظر آیا ملکِ سخن کنکری　　غزل کنکری اور بھجن کنکری
تب: پلٹ کر جو دیکھا سماں اور تھا　　کہ پردے میں فتنہ نہاں اور تھا
نیا شور لے کر جمودی اُٹھے　　سخنور گئے اور نمودی اُٹھے

نہاں رازِ مطلوب و طالب رہا
ہر آواز پر میر غالب رہا

نہ چشمِ بصیرت نہ ذوقِ ہنر　　ہوئیں ساری اقدار زیر و زبر
رہ و رسمِ اجداد سے کٹ گئے　　ہم اپنی روایات سے کٹ گئے
یہاں میرؔ و غالبؔ کا فن کیا کرے　　سخن ساز عرضِ سخن کیا کرے
اُجڑتا رہا بوستانِ ادب　　مگر پھول کھلتے رہے زیرِ لب

مجھے شورِ چرخ و زمیں لے گیا
تصور کہیں سے کہیں لے گیا

بدلنے لگی آسمانوں کی لے — نیا چاند اُترا سرِ برگِ نے
زمیں اجنبی آسماں اجنبی — سفر اجنبی کارواں اجنبی
کہیں بدلیاں گیت گاتی ہوئیں — کہیں بارشیں گنگناتی ہوئیں
کسی مدھ بھری صبح کی آس میں — شتر مرغ دبکے ہوئے گھاس میں

ستارے گئے ظلمتوں کو لئے
چٹکنے لگے شاخچوں پر دیے

کُھلا جنتِ صبح کا در کُھلا — یہ آوازِ اللہ اکبر کُھلا
ہوئے نغمہ زن طائرانِ چمن — کہ عرصے میں اُترے ہیں اہلِ سخن

نئے دن کا سورج دمکنے لگا
زمیں کا ستارہ چمکنے لگا (جولائی ۱۹۵۴ء)

(ناصرؔ کو سرزمینِ پاکستان سے جو اچھی اُمیدیں تھیں اُن کی نشاندہی مندرجہ بالا بند سے ہوجاتی ہے) ان دونوں نظموں کی نسبت "شہرِ غریب" زیادہ شاعرانہ حسن لیے ہوئے ہے۔ اس میں شاعر کی معصوم و پاک خواہشوں کا ذکر ہے۔ اس میں ناصرؔ کے دل سے اٹھتی ہوئی کسک اور دھیمی دھیمی ٹیسیں ہیں۔ شاعر محبوب اور اس کے مکان کی تلاش میں نکلا ہے۔ اس کا "دیا سا مکان" مل بھی گیا لیکن دروازے پر دستک دینے سے پہلے اچانک شاعر نے:

جانے کیوں میں نے ہاتھ روک لیے — یہ مجھے کس خیال نے گھیرا

اور پھر شاعر ایک خیال میں گُم ہو جاتا ہے:

کسی بے نام وہم کی دیمک — چاٹنے آگئی لہو میرا
دشتِ شب میں اُبھر کے ڈوب گئی — کسی ناگن کی ہولناک صدا

تیرے دیوار و در کے سایوں پر　　مجھ کو ہوتا ہے سانپ کا دھوکا
بوٹا بوٹا ہے سانپ کی تصویر　　پتا پتا ہے سانپ کا ٹیکا
آسماں جیسے سانپ کی کُنڈلی　　تارا تارا ہے سانپ کا منکا
تیرے گھر کی طرف سے میری طرف　　بڑھتا آتا ہے ایک سایا سا
دھوپ سا رنگ برق سی رفتار　　جسم شاخِ نبات سا پتلا
پھول سا پھن چراغ سی آنکھیں　　یہ تو راجا ہے کوئی سانپوں کا
ہاں مری آستیں کا سانپ ہے یہ　　کیوں نہ ہو مجھ کو جان سے پیارا
کہ اچانک: ایک ہی پل میں یوں ہوا غائب　　جیسے پانی سے عکس بجلی کا
تب: کٹ گئی پھر مرے خیال کی رو　　شیشۂ خواب کار ٹوٹ گیا

اور یہ خواب و خیال میں دیکھے ہوئے سانپ دراصل شاعر کے دشمن یعنی اس کے خوف اور دکھ ہیں۔ شاعر ہوش میں آگیا تو اُسے اپنے خواب کی تعبیر معلوم ہوئی:

ناگہاں سیٹیاں سی بجنے لگیں　　رات کا شہر پل میں جاگ اٹھا
آنکھیں کھُلنے لگیں دریچوں کی　　سانس لینے لگی خموش فضا
میں تو چُپ چاپ چل رہا تھا مگر　　شہر والوں نے جانے کیا سمجھا
تیری بستی میں اتنی رات گئے　　کون ہوتا بھلا یہ میرے سوا

اور یہ ہیں اس نظم کے آخری اشعار، جو اس کا حاصل ہیں۔

ارے یہ میں ہوں تیرا شہرِ عزیز　　تو گلی میں تو آ کے دیکھ ذرا
سوچتا ہوں کھڑا اندھیرے میں　　تو نے دروازہ کیوں نہیں کھولا
میرا ساتھی میرا شریکِ سفر　　رہ گیا پچھلی رات کا تارا
کہاں لے آئی تو مجھے تقدیر　　میں کہاں آگیا ہوں میرے خدا
یہاں پھلتا نہیں کوئی آنسو　　یہاں جلتا نہیں کسی کا دیا

تیرا کیا کام تھا یہاں ناصرؔ
تو بھلا اِس نگر میں کیوں آیا

اس نظم کے کئی اشعار میں غزل کے اشعار کی سی خوبی ہے۔

آ رہی ہے یہ کس کے پاؤں کی چاپ — پھیلتا جا رہا ہے سناٹا

یہ دیا سا ہے کیا اندھیرے میں — ہو نہ ہو یہ مکان ہے تیرا

ناصرؔ نے ایک منظوم ڈرامہ بھی لکھا جو خاصا طویل ہے۔ اس کی کہانی کشش رکھتی ہے۔ شام کا وقت ہے۔ ریل گاڑی ایک پہاڑی علاقے میں فراٹے بھرتی ہوئی جارہی ہے۔ درمیانے درجے کے چھوٹے سے ڈبے میں چند مسافر بیٹھے ہیں جن میں احمد، فیاض اور عبدل بھی ہیں۔ عبدل اس ڈرامے کا مرکزی کردار ہے۔ اس کا گاؤں راستے میں پڑتا ہے۔ وہ سات سال بعد اپنے گاؤں لوٹ رہا ہے۔ احمد اور فیاض عبدل کے گاؤں میں رہتے ہیں لیکن وہ دونوں عبدل سے ناواقف ہیں۔ احمد اور فیاض آپس میں باتیں کرتے ہیں۔ احمد فیاض سے پوچھتا ہے کہ "کہاں جائیں گے آپ؟" فیاض کہتا ہے "سورج پور! بس اگلے اسٹیشن سے آگے۔" عبدل ذرا دور کونے میں کھڑکی کی طرف بیٹھا ہے۔ وہ سورج پور کا نام سنتے ہی چونک پڑتا ہے اور پھر کسی خیال میں کھو جاتا ہے۔ احمد کہتا ہے "ارے پھر تو اک ساتھ اُتریں گے۔ میں تو نویں شہر جاؤں گا۔" جب فیاض کہتا ہے:

فیاض = وہاں تو اپنا کاروبار ہے
پچھلے دنوں ہی بھائی نے ہوٹل کھولا ہے
اب اچھا خاصا چلنے لگا ہے
سورج پور میں اپنا گھر ہے
اونچی مسجد سے کچھ آگے وہ جو عظمت منزل ہے نا
وہی ہمارا گھر ہے۔

یہ سن کر عبدل جو کونے میں خاموشی سے بیٹھا ہے چونکتا ہے اور غور سے دیکھنے پر پہچان جاتا ہے

کہ یہ اس کے بچپن کا دوست ہے۔

عبدل = (سوچتا ہے) یہ فیاض ہے! عظمت منزل والوں کا وہ منجھلا لڑکا!!

یہ میرے بچپن کا ساتھی......!

یہ اب کتنا بدل گیا ہے....!

احمد کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کاٹیج گھر جس کے مالک اور حصہ دار پہلے عبدل اور اس کا عزیز دوست حسنی تھے، اب وہ احمد اور اکبر کے پاس ہے۔ احمد فیاض سے پوچھتا ہے "کیا آپ عبدل سے واقف ہیں؟" تب عبدل احمد کو بھی جان جاتا ہے:

عبدل = (سوچتا ہے) یہ احمد ہے! اکبر میرے دوست کا ساتھی!

کبھی کبھی یہ اکبر سے ملنے آتا تھا۔

اکبر میرا دوست مجھے کیا بھول گیا ہے؟

اکبر، حسنی دونوں ساتھی سوچتے ہوں گے

میں اور نندی دونوں جل کر......

احمد، فیاض کو نئے شہر میں بسنے کو کہتا ہے تب فیاض بڑے دکھ سے ذکر کرتا ہے کہ

فیاض = سورج پور اب پھر نہ بسے گا

آج سے سات برس پہلے جب اس جنگل کو آگ لگی تھی

وہ دن اپنے گاؤں کی بربادی کا دن تھا۔"

کنویں کا ذکر ہوتا ہے تو عبدل کو اپنی محبوبہ (اور اس ڈرامے کی ہیروئن) نندی سے کنویں پر ملاقات یاد آجاتی ہے۔ اسے اپنا بچپن یاد آتا ہے، جب وہ اور حسنی کھیل کود میں مصروف تھے کہ سورج پور کے نمبردار کا بیٹا بلھا اور اس کی بہن نندی آجاتے ہیں۔ نندی بھائی کے منع کرنے کے باوجود عبدل

کے پاس چلی آتی ہے اور اس سے کل پھر ملنے کا وعدہ کرتی ہے۔ بلھا اسے زبردستی کھینچ لے جاتا ہے پھر عبدل کو اپنی جوانی کا زمانہ یاد آتا ہے۔ چیت کا میلہ یاد آتا ہے۔ میلے میں عبدل اور حسنی کے علاوہ نندی بھی ہے۔ عبدل نندی سے بات کرتا ہے مگر وہ اپنے بھائی کے ڈر سے گھبرا جاتی ہے۔ پھر عبدل گاؤں کی لڑکیوں کو دور درخت کے پیچھے سے جھانکتا ہے۔ نندی کی سہیلیاں اُسے چھیڑ رہی ہیں کہ اتنے میں عبدل گھوڑے پر سوار سامنے آجاتا ہے۔ سہیلیاں ڈر کر ایک طرف بھاگ جاتی ہیں اور نندی اکیلی رہ جاتی ہے:

عبدل = آؤ میں تم کو گھر چھوڑ آؤں

دیکھو! سورج کتنا نیچے اتر گیا ہے ؟

نندی = (ذرا گبھرا کر) نہیں جی! چلے جاؤ

عبدل = ٹھہرو نندی!

نندی = امی کہتی تھیں غیر آدمی سے نہیں بات کرتے۔

تب عبدل نندی کو پچھلی اکٹھی گزاری ہوئی گھڑیاں یاد دلاتا ہے اور نندی اس کی باتیں سنتی ہے:

عبدل = تم کیا سوچ رہی ہو ؟

نندی = نہیں کچھ نہیں! باؤلی ہوگئی ہوں

عبدل = سوچ رہا ہوں ہم یوں کب تک

ہم یوں کب تک ...... تم ہی سوچو! ...... ہم یوں کب تک!

نندی = چلو اب یہاں سے چلیں۔

عبدل پھر یادوں کی باتیں شروع کر دیتا ہے۔ اتنے میں ریل گاڑی آتی ہے پھر نندی خوفزدہ ہو جاتی ہے۔

نندی = دیکھو وہ کیا شے جھلک مارتی ہے ؟

وہ گھوڑے پہ کون آ رہا ہے ؟

عبدل = اکبر! اکبر اپنا دوست ہے نندی !

(اکبر ان دونوں کے قریب آکر گھوڑا روک لیتا ہے)

اکبر = سلام بھیا! مزے میں ہو۔ خوب کٹ رہی ہے !

ملو گے ڈیرے میں !

رات کو تم ضرور آنا (اکبر چلنے لگتا ہے)

عبدل = اکبر بھیا! ٹھہرو اکبر! بات تو سنتے جاؤ

حسنی کہیں ملے تو کہنا رات کو ڈیرے میں آجائے

اکبر = میں کنج گھر جا رہا ہوں عبدل

تمہارا پیغام بھیج دوں گا !

بڑی اندھیری ہے آج کی شام

آندھی آئے گی ! (اکبر گھوڑے کو ایڑ لگا کر ہوا ہو جاتا ہے)

عبدل = اکبر بھی کیا سوچتا ہو گا ؟

حسنی نے بھی کئی دنوں سے ملنا چھوڑ دیا ہے

نندی = ادھر گرد سی اڑ رہی ہے

عبدل = (لاپرواہی سے) ریت اڑی ہے، کچھ بھی نہیں ہے

نندی = (زیادہ خوف زدہ آواز میں) نہیں وہ ادھر آ رہے ہیں !

چلو اس بنی کے درختوں میں چھپ جائیں !

رات ہو گئی ہے ! (نندی اٹھ کر دوڑنے لگتی ہے)

لیکن عبدل کو اس کے اندر کی آواز اپنی جان بچانے کا مشورہ دیتی ہے اور کہتی ہے " نندی اب نہ ملے

گی . . . . اب آواز نہ دینا عبدل۔ نندی اب آواز نہ دے گی ۔ آگ ہے اندھی۔ آگ ہے

عبدل = (اُٹھ جاتا ہے اور نندی کے پیچھے بھاگتا ہے)

ڈرو نہیں میں ساتھ ہوں نندی !

اس تالاب کے پیپل کے نزدیک نہ جانا۔

ٹھہرو نندی میں بھی آیا

اندھیرے جنگل میں عبدل نندی کو ڈھونڈتا ہے لیکن نندی کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ عبدل تھک کر ایک گھنے درخت کے تنے کے سہارے حیران کھڑا ہو جاتا ہے۔ خاصی رات ہو گئی ہے۔ وہ نندی کے خیال میں کھو جاتا ہے۔

عبدل = ٹھہرو نندی !

ٹھہرو نندی کہاں چلی ہو ؟

رستہ بھول نہ جانا !

اتنے میں لوگوں کا شور سنائی دیتا ہے اور وہ جنگل کو آگ لگا دیتے ہیں ۔

عبدل = کم بختوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔

کیسے بھاگوں ؟

آگ — آگ — آگ

چاروں جانب آگ کا دریا

کہاں ہو نندی ؟

بولو نندی کہاں چھپی ہو!

باہر جاؤں ! —

لیکن نندی !!

نندی مر جائے گی عبدل !

بہری اپنی جان بچالے عبدل ! وہ رٹتہ ہے" اور عبدل واقعی بھاگ جاتا ہے۔ گھر پہنچتا ہے تو ماں باپ لے اور نندی کو کوس بھی رہے ہیں ! اور ماں عبدل کے لئے فکر مند بھی ہے ۔ آخر اپنے اندر کی آواز کے دوبارہ سمجھانے پر عبدل یہاں سے بھی بھاگ جاتا ہے ۔

عبدل سوچوں سے لوٹ آتا ہے ۔ ریل سُورج پُور سے نزدیک ہوتی جا رہی ہے۔ احمد اور فیاض باتوں میں مصروف ہیں ۔ باتوں باتوں میں اکبر کی فیشن ایبل بیوی مونا کا ذکر آتا ہے تو احمد کہتا ہے :

احمد = اجی اب تو نقشہ ہی کچھ اور ہے
وہ زمانہ گیا یہ نئی روشنی ہے
وہ نندی بھی تھی ! آگ میں جل بجھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
تو وہ آگ کس نے لگائی تھی ۔
عبدل نے ! نندی کے بھائی نے ! حسنی نے ! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
تعجب ہے عبدل کہاں تھا ؟
وہ نندی تو جل ہی گئی تھی
تمہیں تو خبر ہے !

فیاض ، آگ کے بہتے دریاؤں میں

اس کی چیخیں ہم نے سنی ہیں
ہم نے لاکھ پکارا — آوازیں دیں
لیکن کوئی نہ بولا ۔

اس کے بعد احمد اس بات کو یاد کرتا ہے کہ کس طرح وہ حسنی اور بندو مرچوں کے کھیت میں بیٹھے تھے

اور حسنی گیت سنا رہا تھا کہ اکبر آتا ہے۔ بندو اس سے عبدل کا حال پوچھتا ہے۔ وہ بتاتا ہے۔ پھر سب مختلف باتوں میں کافی دیر مصروف رہتے ہیں کہ بندو چونک کر کھڑا ہو جاتا ہے:

بندو: دیکھ تو حسنی!

یو کیسی ہے پگھیم پگھی!

بارہ سوار سامنے سے گرد اڑاتے ہوئے آتے ہیں۔ ان میں بلھا بھی ہے۔ جو چیخ رہا ہے "دوڑیو اے! دوڑیو"! بندو کے پوچھنے پر ایک سوار کہتا ہے کہ عبدل نندی کو بھگا لے گیا ہے اور پھر سب گھوڑے آگے بھگا لے جاتے ہیں۔ یہ سب دوست سکتے میں آجاتے ہیں۔ آخر حسنی احمد کو ساتھ لیے عبدل کے پیچھے جاتا ہے۔ احمد واپس جانا چاہتا ہے لیکن حسنی تلاش جاری رکھتا ہے۔ آخر وہ ندی پار کر کے جنگل کے خوبصورت حصے میں آجاتے ہیں۔ اچانک ان کے گھوڑے رک جاتے ہیں۔ احمد پھر بہت اصرار کرتا ہے لیکن حسنی واپس جانے سے انکار کر دیتا ہے کہ اچانک:

احمد: ارے وہ ادھر آگ! . . . . .

اس آگ کے پاس . . . . . ایک آدمی زاد

حسنی اور احمد ڈرتے ڈرتے گھوڑوں کو آگے بڑھاتے ہیں۔ الاؤ کے قریب آجاتے ہیں۔ حسنی آگے ہے۔ دیکھتے ہیں تو:

احمد:- پاس پہنچے تو دیکھا الاؤ پہ اک نار بیٹھی تھی

جلتے الاؤ کے نزدیک عریاں بدن ایک عورت

پریشان بالوں سے منہ کو چھپائے

خدا جانے وہ کون تھی!

ہم نے پوچھا تو کھانے کو دوڑی

ڈرانے لگی اور کہنے لگی "ڈاین ہوں — دور ہو جاؤ ورنہ کلیجہ چبا لوں گی"۔

پہلے تو ہم ڈر گئے، پھر ذرا بڑھ کے حسنی نے نیزہ سنبھالا۔

وہ تھرا گئی زرد سی پڑ گئی۔

آخر حسنی کے یہ بتانے پر کہ وہ گیت سناتا ہے اس ناری نے گیت کی فرمائش کی ۔ وہ سنا رہا ہے کہ

احمد: ارے آگ !

یہ آگ ! — یہ شور

گھوڑے کے ٹاپوں کی آوازوں اور لوگوں کے شور سے جنگل گونج اٹھتا ہے ۔ جنگل کے ایک طرف آگ کے شعلے آسمان تک بلند ہو رہے ہیں ۔ عورت جنگل کی طرف ہی بھاگ جاتی ہے اور حسنی اس کے پیچھے بھاگتا ہے ۔

رات گہری ہو گئی ۔ چاروں طرف سے جنگل دھڑ دھڑ جلتا ہے ۔ ایک عجب بھگدڑ مچی ہے ۔ مختلف آوازیں آتی ہیں ۔

آوازیں: ۱ — وہ ادھر بھاگا !

ارے پکڑو اسے ! جانے نہ پائے ۔

۲ — بڑا اندھیر ہے میرے یارو

بستے گاؤں کی بیٹی کاڈ کے لے گیا حسنی

۳ — منے اپنی آنکھ سے دیکھا ۔ وا حسنی تھا

حسنی ہور نندی دونوں تھے

آخر حسنی پکڑا جاتا ہے ۔ ہجوم اسے مارنے پر تل جاتا ہے ۔ احمد اور کنج گھر کا مینجر روکتے رہ جاتے ہیں ۔ کہتے ہیں پولیس کے حوالے کر دو ۔ اپنے ہاتھوں میں قانون لینا حماقت ہے ۔ کوئی نہیں مانتا ۔ بلھا کہتا ہے ،

بلھا: یو میرا مجرم ہے یارو

ان نوں میرے پاس لیاؤ

حسنی اپنے بے گناہ ہونے کا کہتا ہے لیکن بلھا نہیں مانتا اور کہتا ہے " تو پہلے اپنا وار کر پھر روک میرے وار کو" اور آخر دونوں میں لڑائی ہو جاتی ہے۔ احمد یہ سب کچھ تفصیل سے فیاض کو بتا رہا ہے۔ گاڑی اُڑی جا رہی ہے۔ رات اور گہری ہو گئی۔ احمد جب اس عورت کا ذکر کرتا ہے جو آگ کے پاس بیٹھی تھی تو عبدل بھی یہ باتیں سن رہا ہے اور اس کا جسم پسینہ پسینہ ہو رہا ہے اسے آج کئی باتوں کا علم ہو رہا ہے، مثلاً، یہ کہ اس کے ماں باپ سیلاب میں مر گئے ۔ اور حسنی نے کیا کچھ کیا۔ حسنی اور نندی پر کیا بیتی۔

احمد: پھر کیا ہوا یہ نہ پوچھو
وہ ناری خدا جانے غائب ہوئی، جل بجھی، بھاگ نکلی
خدا جانتا ہے

فیاض: وہ بزدل پھر گاؤں چھوڑ کے کیوں بھاگا تھا؟

احمد: کوئی کہتا ہے عبدل وہیں جل گیا
کوئی کہتا ہے یہ جھوٹ ہے وہ کسی دوسرے گاؤں میں تھا
مگر یہ مجھے علم ہے یا خدا جانتا ہے
کہ حسنی مرے ساتھ تھا
وہ تو ناحق ہی مارا گیا
میں نے لوگوں کو روکا بڑی منتیں کیں
بلھا تو غصے میں اندھا تھا
بس دونوں لڑنے لگے اور وہیں کٹ مرے

عبدل سوچ میں ڈوب جاتا ہے۔ طرح طرح کے خیال اسے آوازیں دیتے ہیں۔ سُورج پُور اب بالکل نزدیک آگیا ہے۔ عبدل جسے سُورج پُور اُترنا تھا اسے اس کی سوچیں کہہ رہی ہیں :-

تب یہ آواز اسے کہتی ہے کہ وہ نندی، حسنی، اپنے ماں باپ اور بلھے کا قاتل ہے۔ عبدل اپنی سوچ کی یہ آوازیں سن کر گھبرا جاتا ہے۔

آواز۔ سورج پور اترو گے عبدل

وہاں نہ جانا

وہاں ترا اب کوئی نہیں ہے

عبدل: تو جھوٹا ہے

نندی اپنی موت مری ہے

حسنی میرا جگری دوست تھا

آواز: تو بزدل ہے!

تو نے سورج پور کو اجاڑا

تب اچانک کہانی یوں ختم ہوتی ہے:۔

احمد: ارے کیا ہوا دیکھنا تو

یہ گاڑی کھڑی ہوگئی؟ رفیاض عبدل کی طرف غور سے دیکھتا ہے اور اسے پہلی بار مخاطب کرتا ہے

فیاض: کون سا اسٹیشن ہے بھائی؟

آپ یہاں اتریں گے صاحب؟

احمد: نہیں! یہ تو جنگل ہے

گاڑی یہاں کیوں رکی

کوئی آواز بھی تو نہیں

کوئی بتی نہیں!

یہ تو جنگل ہے سنسان جنگل

اور یوں یہ کہانی اختتام تک آکر حسب معمول گہری دھند کے پیچھے چھپ جاتی ہے۔ یہی نام کرتے

ہیں کہ انجام کو واضح نہیں کرتے۔ ناصر اس کہانی میں کلائمکس پیدا کرنے میں تو ضرور کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ منظوم ڈرامہ سیدھے سادے انداز میں، صاف زبان میں لکھا گیا ہے۔ کرداروں کی انفرادیت بھی جھلکتی ہے۔ اس ڈرامے میں خامیاں بھی ہیں مگر یوں معلوم ہوتا ہے اس پر ناصر نے بہت محنت کی تھی۔ کہانی کے بیچ بیچ میں ہی اس کے انجام کی پیش گوئی بھی ہو جاتی ہے۔ مثلاً جب عبدل نندی کو بتاتا ہے کہ بچپن میں ہم فاختہ کو تنگ کرتے تھے تو:

نندی: (گھبرا کر) امی کہتی تھیں یہ ایک مقدس پرندہ ہے
اس کو نہیں مارتے
اک دن میرے بھیا کو امی نے مارا تھا
وہ فاختہ مار لایا تھا۔

یا جب اکبر کہتا ہے — "بڑی اندھیری ہے آج کی شام — آندھی آئے گی"
اس ڈرامے میں ناصر کی منظر نگاری کی ایک جھلک دیکھیے۔

"وہ دیکھو! — وہ رنگ برنگے ذرے
بھورے بھورے نیلے نیلے پتھر!
ریت کے تارے آگ کی ہولی کھیل رہے ہیں
پیلی کرنیں کیکر کی سیڑھی سے اُتر رہی ہیں۔

ہوا کتنی خاموش ہے
فاختہ ریت کے نرم بستر پہ چپ چاپ بیٹھی ہے
ندی ہے، ندی کا پانی ہے، پانی کی آواز ہے
فاختہ بہتے پانی کے شیشے میں اپنے ہی روپ کو تکتی ہے"

یہ تو ہوئیں طویل نظمیں۔ اب مختصر نظموں کی طرف آئیں۔ سب سے پہلے تو ہم ناصر کی وہ

نظمیں دیکھیں جو انھوں نے ترجمہ کیں۔ یہ ہیں چینی نظمیں۔

۱۔ چائن ونتائی ــ "جاڑے کی رات"

۲۔ وی۔ تی ــ "پی، فو، جن"

۳۔ تزمے۔ یے ــ "گیت" (رسالہ "سویرا" ۱۷-۱۸)

اور یہ ہیں مغربی امریکہ کے گوالوں کے گیت

۴۔ سام سا س

۵۔ خدا حافظ، بوڑھے پینٹ

۶۔ ہوپی ٹی ہی یو، ــ آگے بڑھو میرے بچھڑو

۷۔ پرانے "چس ہوم" کا سفر

۸۔ خون آلودہ زین (امریکی سوسائٹی۔ ترجمہ ناصر کاظمی۔ اُردو مرکز لاہور)

ان کا ترجمہ ناصر نے خاصی خوبصورتی سے کیا۔ ان کی اہم بات یہی ہے کہ ترجمہ کر کے ناصر نے انھیں پاکستانی نظمیں بنانے کی سعی کی ہے اور یہ اس لئے محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے الفاظ کا استعمال ہی اس سلیقے سے کیا ہے۔ اب مثلاً یہ نظم دیکھیے۔

پی، فو، جن

اس کے ریشمی پھرن کی سرسراب خاموش ہے

مرمر کی پگ ڈنڈی دھول سے اٹی ہوئی ہے

اس کا خالی کمرہ کتنا ٹھنڈا اور سونا ہے؟

دروازوں پر گرے ہوئے پتوں کے ڈھیر لگے ہیں

اس سندری کے دھیان میں بیٹھے

میں اپنے دکھیارے من کی کیسے دھیر بندھاؤں

اب "پرانے چس ہوم کا سفر" نظم کا ایک اقتباس دیکھیے

" میں اپنے مالک کے پاس معاوضہ لینے کے لئے گیا
اس نے پہلے ہی حساب لگا رکھا تھا کہ میرے نوڈالر بنتے ہیں۔
اب میں جلد سے جلد اپنا ساز و سامان بیچ دوں گا۔
اب میں کسی کمبخت کے لئے مویشیوں کا ریوڑ نہیں ہانکوں گا
اب میں اپنے گھوڑے کی زین پر مزے سے بیٹھ جاؤں گا اور آزادی کا سانس لوں گا
آئندہ میں گایوں کے ریوڑ کبھی نہیں لے جاؤں گا
اے میرے ریوڑ کے مالک خدا حافظ ! میں تمہیں کوئی بد دعا نہیں دیتا
اس کام کو خیر باد کہہ کر اب میں کھیتی باڑی شروع کروں گا۔"

اور اب یہ ہیں ناصر کی اپنی مختصر نظمیں — ان پر بھی ایک نظر ڈالتے ہیں۔

۱۔ ساتواں رنگ

بال کالے، سفید برف سے گال
چاند سا جسم، کوٹ بادل کا
لہریا آستین، سُرخ بٹن
کچھ بھلا سا تھا رنگ آنچل کا
اب کے آئے تو یہ ارادہ ہے
دونوں آنکھوں سے اس کو دیکھوں گا

(رسالہ "سویرا" ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱)

پہلے چار مصرعوں تک یوں لگتا ہے کہ ایک تصویر میں رنگ بھرے جا رہے ہیں اور یہ ابھی مکمل ہوا چاہتی ہے کہ اگلے دو مصرعے ساری تصویر پر ہی پردہ ڈال دیتے ہیں۔ غالباً مطلب یہ ہے کہ حُسن کے مجسمے کو جی بھر کر دیکھوں گا۔ لیکن بات کا ابلاغ ہو گا تو تب اثر بھی ہو گا۔ آخر دونوں

آنکھوں سے دیکھنے سے کیا ہو گا ؟

۲- گجر پھولوں کے

اک کرن چشم و چراغِ دلِ شب
کیوں اسے خونِ رگِ دل نہ کہوں
رقص کرتی ہے کبھی شیشوں پر
کبھی روزن سے اتر آتی ہے
کبھی اِک جامۂ آویزاں کی
نرم سلوٹ کے خنک گوشوں میں
گیت بُنتی ہے گجر پھولوں کے

(رسالہ "سویرا" ۱۹-۲۰-۲۱)

پھر وہی چیز — بات شروع تو بہت خوبصورتی سے ہوئی تھی لیکن " اچھا تو پھر کیا ہے - پھر کیا ہوا ؟ " کا سوال یونہی فضا میں تیرتا رہ گیا اور یہ سوال کوئی تعمیری پہلو لیے نہیں آتا ، کیونکہ جواب میں خاموشی ملتی ہے ۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ انھوں نے نظم کو کچھ بھی نہیں دیا ۔ اُن کے ترانوں اور ملی نغموں کی مقبولیت اب بھی برقرار ہے پھر قابلِ قدر نعتیہ نظمیں بھی ہیں ۔ اصل میں ان کی وہ نظمیں جو غزل کی طرز پر ہیں یا وہ غزلیں جو نظم کہلائے جانے کی مستحق ہیں ، وہ ایک اچھی خوبصورت اور مکمل نظم کا تاثر دیتی ہیں ۔ مثلاً یہ نظم دیکھیے جو رسالہ " سویرا " میں تو انھوں نے — " درختوں میں " کے عنوان سے چھپوائی لیکن " دیوان " میں اسے خود ہی غزل قرار دے کر شامل کر لیا ۔

درختوں میں

گا رہا تھا کوئی درختوں میں رات نیند آ گئی درختوں میں

چاند نکلا افق کے غاروں سے — آگ سی لگ گئی درختوں میں
مینہ جو برسا تو برگ ریزوں نے — چھیڑ دی بانسری درختوں میں
کتنی آبادیاں ہیں شہر سے دور — جاکے دیکھو کبھی درختوں میں

(دیوان ص ۸۴)

"یہ نظم" آخر تک پڑھ جائیے، آپ بھول ہی جائیں گے کہ اس پر "غزل" کا عنوان نہیں ہے۔ میں یہاں کچھ ایسی غزلوں کا ذکر کرتی ہوں جنہیں نظم بھی کہہ دیا جائے تو کوئی فرق نہیں پڑتا مثلاً "برگِ نے" کی یہ غزل کیا نظم نہیں ہے؟ حتیٰ کہ ایک نظم کی طرح سے اس کے پہلے دو مصرعے آخر میں پھر دوہرائے گئے ہیں یوں ایک تاثر شروع سے آخر تک برقرار رہتا ہے۔ شاعر خدا سے شکوہ کر رہا ہے اور اسے اسی کی دنیا دکھا رہا ہے یوں تو ناصر زمیوں کا شاعر ہے لیکن یہاں ایک ایسی دبی دبی چیخ کے اچانک بلند ہونے کا احساس ہوتا ہے جو دنیا والوں کے ظلم کے خلاف احتجاج کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں بغاوت نہیں ہے بلکہ صرف احتجاج ہے۔

او میرے مصروف خدا — اپنی دنیا دیکھ ذرا
اتنی خلقت کے ہوتے — شہروں میں ہے سناٹا
جھونپڑی والوں کی تقدیر — بجھا بجھا سا اک دیا
خاک اڑاتے ہیں دن رات — میلوں پھیل گئے صحرا
زاغ و زغن کی چیخوں سے — سونا جنگل گونج اٹھا
سورج سر پہ آ پہنچا — گرمی ہے یا روزِ جزا
پیاسی دھرتی جلتی ہے — سوکھ گئے بہتے دریا
فصلیں جل کر راکھ ہوئیں — نگری نگری کال پڑا
او میرے مصروف خدا — اپنی دنیا دیکھ ذرا

(برگِ نے ص ۲۹)

شہر در شہر گھر جلائے گئے
یوں بھی جشنِ طرب منائے گئے
اک طرف جھوم کر بہار آئی
اک طرف آشیاں جلائے گئے
اک طرف خونِ دل بھی تھا نایاب
اک طرف جشنِ جم منائے گئے
کیا کہوں کس طرح سرِ بازار
عصمتوں کے دیئے بجھائے گئے
آہ وہ خلوتوں کے سرمائے
مجمعِ عام میں لٹائے گئے
وقت کے ساتھ ہم بھی اے ناصر
خار و خس کی طرح بہائے گئے
(برگ نے ص ۴۵)

اب مندرجہ ذیل غزل دیکھیے۔ بیشک یہ ایک مسلسل غزل ہے لیکن کیا یہ ۱۹۴۷ء کے بعد لکھی جانے والی ترقی پسندوں کی نظم سے بہت مختلف ہے؟ میرے خیال میں ایسا نہیں ہے بلکہ اس میں بھی وہی انسانیت کی تباہی پر دُکھ اور غم کا اظہار ہے۔ بے شک یہ نقّادوں کے بتائے ہوئے نظم کے اس تقاضے کو پورا نہیں کرتی کہ اس میں سے ایک شعر بھی نکال دیا جائے تو نظم کی وحدت میں فرق آجاتا ہے، لیکن ایسا تو ہے کہ پوری نظم پڑھ کر صرف ایک ہی صورتِ حال کے مختلف رُخ سامنے آکر ایک مجموعی تاثر قائم کرتے ہیں۔ اس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ اختتام کو اُلجھا نہیں دیتی بلکہ اپنی تکمیل کرتی ہے:

کیا ایسا نہیں ہے کہ یہاں آخری شعر ایک فل سٹاپ کی حیثیت رکھتا ہے کہ یہ ہے مندرجہ بالا صورتِ حال کا انجام۔ اس کا تسلسل اسی طرح کی ایک اور غزل سے (جو "دیوان" میں شامل ہے) جا ملتا ہے۔ جو

یوں شروع ہو کر:۔

سُناتا ہے کوئی بھولی کہانی　　مہکتے میٹھے دریاؤں کا پانی
یہاں جنگل تھے آبادی سے پہلے　　سنا ہے میں نے لوگوں کی زبانی

اس طرح ختم ہوتی ہے:

نئی دنیا کے ہنگاموں میں ناصؔر　　دبی جاتی ہیں آوازیں پرانی (دیوان ص ۱۸)

اب جو غزل آئے گی اس کا عنوان ہونا چاہیئے تھا "بسنت آگئی"

کُنج کُنج نغمہ زن بسنت آگئی　　اب سجے گی انجمن بسنت آگئی
اُڑ رہے ہیں شہر میں پتنگ رنگ رنگ　　جگمگا اٹھا گگن بسنت آگئی
موہنے لبھانے والے پیارے پیارے لوگ　　دیکھنا چمن چمن بسنت آگئی
سبز کھیتیوں پہ پھر نکھار آگیا　　لے کے زرد پیرہن بسنت آگئی

پچھلے سال کے ملال دل سے مٹ گئے
لے کے پھر نئی چبھن بسنت آگئی

اور یہ ہے "کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ" کہنے والے گرجتے ہوئے اقبال کے برابر برابر ناصؔر کی نرم مگر گونجیلی آواز:

چند گھرانوں نے مِل جُل کر　　کتنے گھروں کا حق چھینا ہے
باہر کی مٹی کے بدلے　　گھر کا سونا بیچ دیا ہے
سب کا بوجھ اُٹھانے والے　　تو اس دنیا میں تنہا ہے
میلی چادر اوڑھنے والے　　تیرے پاؤں تلے سونا ہے

گہری نیند سے جاگو ناصر
وہ دیکھو سورج نکلا ہے (دیوان ص ۱۲۳)

اس سلسلے کی اب آخری غزل یعنی "نظم" دیکھیے۔ یہ "دیوان" سے لی گئی ہے اور "دیوان" کی کئی ایسی غزلیں اسی طرح کا تسلسل لیے ہوئے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ناصر کی شروع کی نظمیں تو صرف تجربہ تھیں، جبکہ یہ نظمیں اس خود بخود اُٹھنے والے جذبوں کے تحت کہیں جو بات کا واضح طور پر اظہار کرنا چاہتے ہیں، جو ارد گرد کی جاگتی شور مچاتی زندگی کو دیکھ پرکھ کر اس کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔ اب مافوق الفطرت پُراسراریت نہیں ہے بلکہ حقائق کا بیان ہے:

وہ ساحلوں پہ گانے والے کیا ہوئے
وہ کشتیاں چلانے والے کیا ہوئے

وہ صبح آتے آتے رہ گئی کہاں
جو قافلے تھے آنے والے کیا ہوئے

میں ان کی راہ دیکھتا ہوں رات بھر
وہ روشنی دکھانے والے کیا ہوئے

یہ کون لوگ ہیں مرے اِدھر اُدھر
وہ دوستی نبھانے والے کیا ہوئے

وہ دِل بِن کھُبنے والی آنکھیں کیا ہوئیں
وہ ہونٹ مسکرانے والے کیا ہوئے

عمارتیں تو جل کے راکھ ہو گئیں
عمارتیں بنانے والے کیا ہوئے

اکیلے گھر سے پوچھتی ہے بے کسی
ترا دیا جلانے والے کیا ہوئے

یہ آپ ہم تو بوجھ ہیں زمین کا
زمیں کا بوجھ اٹھانے والے کیا ہوئے

ناصر نے ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں میں ترانے بھی لکھے۔ ۶۵ء کی جنگ میں اپنا ایک ترانہ ریڈیو پاکستان میں ریکارڈ کیا جو بہت مقبول ہوا" زندہ دلوں کا گہوارہ ہے۔ سرگودھا میرا شہر — میرا شہر"۔ اس کے علاوہ انہوں نے یہ ترانہ تو ہے عزیز ملت تو ہے نشانِ حیدر" اور" سیالکوٹ تو زندہ رہے گا" انہوں نے سرزمین پاکستان سے ہمیشہ کی نشاندہی کی ہے۔

؎ کھلا جنتِ صبح کا در کھلا — با آوازِ اللہ اکبر کھلا

ہوئے نغمہ زن طائرانِ چمن — کہ عرصے میں اترے ہیں اہلِ سخن

نئے دن کا سورج دمکنے لگا — زمین کا ستارہ چمکنے لگا

یہیں مجھے ناصر کی وہ نظم یاد آ گئی جس نے فطرت کے چیلنج کے مقابلے میں حصہ لیا اور آخر اُسے شکست دے دی۔ یہ نظم گائی تھی استاد امانت علی خاں نے جو ناصر کی ہی عمر جتنے ہو کر فوت ہو گئے۔ استاد امانت نے اس نظم کو ملہار کے سُروں میں گانے کا ارادہ کیا۔ انہوں نے پہلے دو نفل پڑھے اور پھر گیت گانے اسٹوڈیو میں چلے گئے اور جب وہ گا رہے تھے تو باہر بارش شروع ہو چکی تھی، جس کا عرصے سے انتظار تھا۔ یہ واقعہ مدتوں لاہور میں گھومتا پھرا۔ نظم یہ تھی:

بارش کی دعا

اے داتا بادل برسا دے
فصلوں کے پرچم لہرا دے

دیس کی دولت دیس کے پیارے
سوکھ رہے ہیں کھیت ہمارے

ان کھیتوں کی پیاس بجھا دے
اے داتا بادل برسا دے

یوں برسیں رحمت کی گھٹائیں
داغ پرانے سب دُھل جائیں
اب کے برس وہ رنگ جما دے
اے داتا بادل برسا دے
کھیتوں کو دانوں سے بھر دے
مردہ زمیں کو زندہ کر دے
کیاری کیاری پھول کھلا دے
اے داتا بادل برسا دے
تو سنتا ہے سب کی دعائیں
داتا ہم کیوں خالی جائیں
ہم کو بھی محنت کا صلا دے
اے داتا بادل برسا دے

(۲ - فروری ۱۹۶۷ء)

ناصر کاظمی کی نظموں کے اس جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ناصر خود سراسر غزل تھے اور اگر وہ غزل کی طرز پر (اقبال کی طرح) نظمیں کہتے تو نظموں کی کامیابی یقینی تھی لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ ایک بہترین غزل گو کو لازمی طور پر نظم نگار کا لبادہ بھی پہنا دیا جائے؟ ناصر نے غزل کہی اور بہت عمدہ غزل کہی۔ نظم میں تجربہ کیا لیکن کچھ زیادہ کامیاب نہ ہوئے۔ بعد میں یہی نظم گوئی کا جذبہ "پہلی بارش" کی مسلسل غزلوں میں اپنا اظہار کر گیا۔ ان ۲۴ غزلوں کو اگر ایک تسلسل میں دیکھیں تو انسانی زندگی کے طویل سفر کے سنگِ میل دکھائی دے جائیں گے۔

(ب) نثر

ناصر کی نظموں میں اُداسی تو نمایاں ہے ہی لیکن اس میں ڈرا دینے والی پُراسراریت کا عنصر

بھی شامل ہو گیا ہے۔ یوں پڑھنے والا اپنے آپ کو ایک گھٹی گھٹی، اُداس اُداس فضا میں سہمے سہمے قدم اٹھاتا محسوس کرتا ہے۔ اس کے برعکس ان کی نثر بہت شگفتہ ہے جسے پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ناصر گہری گہری سنجیدہ باتیں سوچنے کے علاوہ ہنسا بھی کرتے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی نثر لطیفوں اور چٹکلوں کا مجموعہ ہے۔ یہ نثر سنجیدہ موضوعات پر تو ہے لیکن اس کو پڑھتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے باغوں میں کھلے تازہ تازہ گلابوں کی مہک اُڑی چلی آ رہی ہے۔ یہ نثر کبھی بھی کوئی ٹھوس تحقیقی مقالے معلوم نہیں ہوتی بلکہ یہ گفتگو ہے، اپنے آپ سے کی جانے والی نہیں بلکہ محفل میں موجود ہونے کے احساس کے تحت کی جانے والی گفتگو۔ کیسی پُرمعنی اور خوبصورت گفتگو ہے۔ عام طور پر کی جانے والی باتوں سے الگ تھلگ ایک منفرد انداز لیے ہوئے۔ یہ تو طے ہے ہی کہ ناصر نے شاعری اور زندگی کو ایک کر رکھا تھا۔" پھر ناصر کی گفتگو اتنی اوریجنل اور اتنی تخلیقی تھی کہ . . .

میرا جی چاہتا تھا کہ وہ باتیں کرتا جائے اور میں سنتا جاؤں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ باتیں نہیں کر رہا ہے، بلند آواز میں شعر سوچ رہا ہے اور اس کی گفتگو ہمیشہ شعر و ادب کے بارے میں ہوتی تھی اور اشعار کے حقیقی مفہوم کو اُجاگر کرنے کے لئے وہ زبان و بیان اور جذبہ و خیال کے بے شمار نکات کھولتا چلا جاتا تھا۔[1] یہ "بلند آواز میں شعر سوچنے" کی سی کیفیت ان کی نثر میں بھی ہے اور اسی لیے تو ناصر کی نثر نیا اور الگ سا اسلوب رکھتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نثر سے شاعری کو ذرا دور دور رکھنا چاہیئے۔ لیکن ناصر کے ہاں شاعری نثر میں اس خوبصورتی سے سمائی ہے کہ اگر اسے نکال دیں تو ناصر کا اسلوبِ نثر ہی ویران ہو جائے گا۔

ناصر کی نثر کی خصوصیات کو دیکھنے سے پہلے یہ جان لینا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ ناصر کو جس طرح قدیم شعراء کا کلام بے حد عزیز تھا اور خصوصاً میرؔ سے ان کا لگاؤ اس انتہا تک پہنچ گیا تھا کہ انہوں نے میرؔ کی کلیات کے کئی جزو بنا لیے تھے جن میں سے کوئی نہ کوئی ہر وقت ناصر کے پاس ہوتا۔ اسی

---

[1] احمد ندیم قاسمی "فنون" اپریل ۱۹۷۲ء (ناصر کاظمی کی یاد میں) ص ۲۸-۲۹

طرح ناصر پرانی نثر سے بھی انجان یا بے گانہ نہ تھے۔ ان کے بڑے بیٹے باصر سلطان کاظمی نے بتایا کہ ناصر کی میز پر ہر وقت محمد حسین آزاد کی "آبِ حیات" رکھی رہتی۔ آزاد (بحیثیت نثر نگار) سے ان کی اس دوستی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ آزاد سے ان کی دلچسپی کی وجہ صرف یہ نہیں ہو سکتی کہ وہ بھی اپنے پرانے زمانوں کی یادیں تازہ کئے رکھتے ہیں، بلکہ ان کی نثر میں جو خوبصورت تمثیلیں ہیں ان کی کشش ناصر کی توجہ اپنی جانب مبذول کراتی ہے۔ ناصر جس کی اپنی امیجری بہت پُر قوت ہے، آزاد کی امیجری سے کچھ لیں یا نہ لیں لیکن ان کی نثر کو وہ یقیناً پسند کرتے تھے اور یوں تو ان کی نثر کسی شعوری کوشش کے تحت لکھی ہوئی معلوم نہیں ہوتی لیکن ظاہر ہے یہ بات نہیں۔ یہ نثر جتنی بے ساختہ معلوم ہوتی ہے اتنی ہی اس پر محنت کی گئی ہو گی تو اگر ہم یہ کہیں کہ آزاد کی نثر کی انتہائی عمدہ ترقی یافتہ صورت ناصر کی نثر میں جھلک جھلک جاتی ہے تو میرا خیال ہے اس میں کوئی مضائقہ نہ ہو گا۔

بیشتر شعراء شاعری کے فن کے بارے میں اپنی آراء کا نثر میں اظہار کرتے ہی رہتے ہیں۔ کبھی تو اپنا خیال ظاہر کرنا ہوتا ہے اور کبھی کسی ایسی بات کی وضاحت کرنا ہوتی ہے جو شاعری میں کی تو نہیں جا سکتی لیکن ایسی وضاحت کی ضرورت ہوتی ہے جس کے لئے نثر مناسب ہے۔ ناصر نے بھی اپنی تحریروں اور مباحثوں میں اپنے تصورِ فن پر بہت کچھ لکھا ہے۔

"بڑا شاعر ایک بھرپور انسان بھی ہوتا ہے اور اس کی شخصیت میں بہت سی تہیں ہوتی ہیں مگر چونکہ اس کا ذریعۂ اظہار زبان ہے اس لئے وہ اپنے تخلیقی سفر میں بھی تنہا نہیں ہوتا۔ وہ بے شمار تجربوں کے جہنم سے گزر کر اپنی جنت تخلیق کرتا ہے۔ لہٰذا پڑھنے والے کو بھی اس کے فن کو پورے طور پر محسوس کرنے کے لیئے اس جہنم سے گزرنا پڑتا ہے۔ یوں سمجھیے کہ بڑے شاعر کا پڑھنا ایک سخت امتحان ہے۔ وہ ہر لحظہ آپ کو زندگی کے نئے گوشے اور نئے تجربے سے روشناس کر کے چیلنج کرتا ہے۔ وہ کسی قدر بے درد اور پھکڑ بھی ہوتا ہے......

"بڑے شاعر کا احساسِ الم غم پرستی نہیں بلکہ خود آگاہی اور زندگی کا پیغام ہوتا ہے.....

"کسی فن پارے کو تاریخی دستاویز کے طور پر دیکھنا درست نہیں لیکن اگر شاعر کا تجربہ وسیع

ہو تو اس کی شاعری بھی اپنے زمانے کی تصویر بن جاتی ہے ......

"بڑا شاعر کسی ایک زمانے یا کسی ایک طبقے کے لیے نہیں لکھتا۔ اس لیے اس کی شاعری ہر زمانے سے بار بار ایک نیا تقاضا کرتی ہے۔"[۱]

"لفظوں کا روایتی استعمال تو ہر شخص کرتا ہے لیکن ان میں نئے معنوں کی روح پھونکنا فن کار ہی کا کام ہے۔ یہ لفظوں کا قبیلہ بھی بڑا خود سر واقع ہوا ہے۔ جب بھی کسی نئے لفظ کی ضرورت ہوتی تو زبان کے خیمے کے باہر للکارنا پڑتا کہ اس لفظ کی روح تو ہمارے خیالوں میں ہے اسے حاضرِ بزم کرو۔ شاعر تو لفظوں کو اس طرح گرفتار کر لیتا ہے جیسے شیر ہرن کو اپنے پنجے میں دبوچ لے۔"[۲]

"... میں نے تو لفظوں اور حرفوں کی قوسوں میں جان بھی محسوس کی ہے اور ان کے پیچ وخم کی فریاد بھی سنی ہے۔ یہ حرف "ب" خیمے کا اسم تھا۔"[۳]

"جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ادیب سماج اور قوم کا نفس ہوتا ہے۔ اس کی ذمہ داری عام شہریوں کی ذمہ داری سے بڑھ کر ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے یہاں پوری سماج یا قوم کا شعور سمٹ کر ایک شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس کا اپنے ماضی سے اور اپنی روایت سے کوئی رشتہ ہونا چاہیئے۔ اسے اس خون اور مٹی کا احساس ہونا چاہیئے، جس سے اس کی ذہنیت کا خمیر اٹھا ہے۔ اس کا کوئی دین و مذہب ہونا چاہیئے۔ اجتماعی عقیدے کے بغیر نہ قومیں زندہ رہ سکتی ہیں اور نہ کوئی بڑی تخلیق وجود میں آسکتی ہے ......

"...... اب کوئی یہ کہے کہ دنیا کے کام چھوڑ کر ادب ہی کیوں تخلیق کیا جائے تو

---

[۱] ناصر کاظمی "سویرا" ۱۹-۲۰-۲۱ (جان پہچان۔ میر تقی میر) ص ۲۵۹ تا ۲۸۲

[۲] ناصر کاظمی "سویرا" ۱۷-۱۸ (ایک مکالمہ "خوشبو کی ہجرت") ص ۲۲۰

[۳] ناصر کاظمی "سویرا" ۱۹-۲۰-۲۱ (ایک مکالمہ "رفتار کا بدن") ص ۲۹۴

اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ انسان کے پاس ذہن ہے، تصور ہے، یادوں کا خزانہ ہے اور نا آفریدہ مستقبل کے جواب۔ وہ ان ہیولوں کو جسم دینا چاہتا ہے۔ جب تک انسان میں یہ صلاحیتیں ہیں تخلیق کا سرچشمہ رک نہیں سکتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔

• آج کا شاعر اگر باہر سے بھی اثر لیتا ہے تو وہ اپنی مٹی کے رس اور خوشبو کو ساتھ لے کر چلتا ہے[۱]"

"شاعر نے اس باولے کا بھیس بنا رکھا تھا جو ہر گاؤں کے گرد اگرد چکر کاٹتا ہے اور آنے والے حادثوں کی خبر دیتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ یہ پگلا گاؤں سے کتنا پیار کرتا ہے اور گاؤں والوں کے دکھ میں کس محبت سے اشک فشانی کرتا ہے مگر اس کے باوجود اس پگلے کی پیغمبری ایک بڑا ناگوار اور دل دوز فریضہ ہے جس کو ادا کرنا کسی محفل پرست، دنیا دار اور مصلحت آشنا سخن ساز کے بس کی بات نہیں[۲]"

"مجھے تو ہر ایسے شخص کی دوستی پر شبہ سا ہونے لگتا ہے جو ہر بات کے حق میں ہو اور دوسروں کی مخالفت مول لینے کا جوکھم نہ لے سکے۔ ہر چیز کی مخالفت کرنا بے شک ایک ذہنی بیماری کی علامت ہے مگر ہر بات کے حق میں ہونا بھی ذہنی افلاس کی دلیل ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مفت کی دشمنی مول لینا میرا شیوہ نہیں مگر اپنے دشمنوں کا اعلان کرنا میرا دین ہے ۔ ۔ ۔ ۔ جو ادیب کسی بات کا مخالف نہیں ہیں اسے سرے سے ادیب ہی تسلیم نہیں کرتا ۔ ۔ ۔ ۔ آج تک دنیا میں جو شخص بھی حق بات لے کر اٹھا ہے تو شروع شروع میں زیادہ تر لوگوں نے اس کی مخالفت کی ہے بلکہ مخالفوں ہی نے اس کی بات کو دوسروں تک پہنچانے میں سب سے اہم کردار ادا کیا ہے[۳]"

---

[۱] ناصر کاظمی "نیا دور" ۷ - ۸ (دنیا اسم) ص ۹۲ تا ۱۰۲

[۲] ناصر کاظمی "برگِ نے" (اعتبار نغمہ) ص ۷

[۳] ناصر کاظمی "ادب لطیف" اکتوبر ۶۲ء (غالب کے طرفدار نہیں) ص ۹

"ادیب کے پاس وسائل نہ سہی مگر ایک وسیلہ تو ہے۔ یہ وسیلہ لفظ ہے۔ یہ ایک سو ایکواں داؤں ہے۔ سو داؤں اہلِ وسائل کے پاس ہیں۔ ایک سو ایکواں داؤں ادیب کے پاس ہے اور یہ تو وہ داؤں ہے جس نے فرشتوں کو سجدہ کرا دیا تھا[1]"

ناصر کوئی بہت بڑے نقاد نہیں تھے بلکہ یہ تو ایک شاعر کی شاعری کے بارے میں مختلف اوقات میں دی گئی آرا ہیں۔ یہ آرا کہیں ایک رومانی شاعر کی ہیں اور کہیں ایک حقیقت پسند شاعر کی اور ایسا ہونا بھی تھا کیونکہ ناصر نے رومانویت سے حقیقت پسندی کی طرف سفر کیا ہے۔ ایک وقت میں ناصر یہ کہتے ہیں کہ "جو ہرن زخمی ہو جاتا ہے وہ ڈار سے جلدی ہی بچھڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک آدھ میل تو وہ گرمی میں ڈار کے ساتھ بھاگتا ہے لیکن پھر کسی اکیلے غار یا بنی میں چھپ کر بیٹھ جاتا ہے۔ یہی اکیلا ہرن سب ہرنوں سے زیادہ اجتماعی شعور رکھتا ہے" یعنی تنہائی میں اجتماع کا تصور کر لیتا ہے، جو رومانی تصور ہے۔

دوسرے وقت میں ناصر اس بات کے بھی قائل نظر آتے ہیں کہ فنکار معاشرے میں رہ کر فنکار بنتا ہے۔

"بات یہ ہے کہ باہر کی چیزیں جب اچھی لگتی ہیں جب آدمی کے اندر کچھ زندگی ہو۔ دریا اُس شخص کو بہتا دکھائی دیتا ہے جس کے اندر دریا ہو:

میر دریا ہے سنے شعر زبانی اُس کی

تو یہ دریا کا احساس تو اندر ٹھاٹھیں مارتا ہے، دریا مزاج۔ اسی طرح سے درخت ہے۔ آپ کہتا ہے کہ یہیں سے تو دنیا شروع ہوئی۔ سو یہ درخت تو Growth کا Symbol ہے اور میری شاعری کا جزوِ اعظم ہے۔ درخت، شہر، چاند، پھول، فطرت Romantic چیزیں نہیں ہیں انتظار حسین دراصل یہ ایک بڑی مہذب تہذیب، جسے صدیوں میں انسان نے خون دے دے کر پالا

---

[1] ناصر کاظمی رسالہ "لفظ" ۷۲ء (خطبۂ صدارت) ص ۱۳۹

ہے، اس کے استعارے، اس کی زندہ علامتیں ہیں۔ آپ اندازہ کریں جس شہر میں درخت ہوں، پرندے ہوں، کبوتر ہوں، چڑیاں ہوں، آسمان کھلے ہوں وہ کوئی Romance نہیں، Romantic کون کہتا ہے اسے۔ اس کے پیچھے تصور کرو اُس معاشرے کا کہ کیسے لوگ بستے ہوں گے جنھوں نے وہ پھول لگائے ہیں ہیں، وہ درخت بنائے ہیں۔[۱] ۔ ۔ ۔

"...... شاعر جو ہے وہ ساری انسانیت کے بارے میں سوچتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ جب اوروں کا بھلا ہوگا تو اس کا اپنا بھلا خود بخود ہوگا۔"

"...... اچھا لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنا لکھے۔ آپ شاعر کے شعر کو ایک ہی میرے پاس معیار ہے سن کر کچھ دیر آپ کو کسی اور کا شعر یاد نہ آئے۔ بس یہی اچھا لکھنا ہے۔ اگر میرا شعر سن کے تمہیں غالب کا شعر یاد آئے تو میں تو جیسے ہاتھی کے پاؤں کے نیچے چیونٹی کا حال ہوتا ہے، وہی حال ہوگا میرا۔ بس اس سے بڑا کیا ہے۔"[۱]

اور یہ جو ناصر نے اپنے ایک خطبے میں کہا تھا کہ "اہلِ وسائل نے وسائل اپنی مٹھی میں رکھے اور مسائل ہمارے کھاتے میں ڈال دیے۔ ادیب اور شاعر سے کہا جاتا ہے کہ تم قوم کے ترجمان ہو، قوم کے مسائل پر لکھو۔ اب یہ مسائل اور وسائل کی جنگ ہے۔ اہلِ وسائل شاداب وادیوں میں ہیں اور ادیبوں کو قومی مسائل پر لکھنے کی نصیحت کر رہے ہیں" تو اس پر احمد ندیم قاسمی نے کہا تھا "منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ادیبوں کو بھی وسائل میں حصہ دار بنایا جائے اور اہلِ وسائل بھی مسائل سے نمٹنے کی کوشش کریں۔ مجھے یا شاید کسی بھی ادیب کو اس خواہش پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔ ادیب کو یقیناً صاحبِ وسائل بھی ہونا چاہیے لیکن وہ صاحبِ وسائل ہو یا بے روزگار ہو، اگر وہ صحیح معنوں میں ادیب ہے تو

---

[۱] ناصر کاظمی۔ ٹی وی انٹرویو ۱۹۷۲ء

وہ مسائل کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا ۔۔۔۔۔ اگر ادیب کے کھاتے میں مسائل ڈال دیے گئے ہیں تو گھبرانے کی کوئی بات نہیں ۔ البتہ ادیب کو وسائل سے کلیتہً محروم رکھنا ادب اور ادیب کی ناقدری کی علامت ہے[۱]

اور میں سمجھتی ہوں کہ ناصر کی سوئی ہوئی اصل سوچ کو ایسی ہی تنقیدوں نے جگا دیا تھا تب ہی تو اپنی زندگی کے آخری سال میں ان کی فکر صحت مندانہ طرز لیے ہوئے تھی اور وہ اپنا کھل کر اظہار کرنے لگے تھے اور بلا جھجک اور بغیر کسی معذرت کے۔ فن کے سلسلے میں ناصر نہ صرف انفرادیت کے قائل ہیں بلکہ وہ اپنی روایت سے نظر بچا لینا بھی اچھا نہیں سمجھتے۔ بلکہ انھیں اپنی قابل قدر روائتیں بہت عزیز ہیں :

روایت تو دراصل پورے اجتماع کے ماضی اور حال کے تجربات کی گونج ہے خواہ وہ زندگی کے کسی شعبے میں پھیلی ہوئی ہوئی ہو۔ محض پرانے شاعروں کو پڑھ لینے سے تو سیدھی سادی غزل گوئی ہی نکل سکتی ہے۔

تیسرے درجے کا لکھنے والا محض روایت کا سہارا لے کر روایتی انداز میں روایتی جذبات کا اظہار کرتا ہے اور پرانے ماہرین کے فن کے بچے تلے مفروضوں کو بغیر ہضم کیے اگل دیتا ہے۔ تیسرے درجے کے لکھنے والے کے قاری بھی تیسرے درجے کے انسان ہوتے ہیں۔ تیسرے درجے کا لکھنے والا روایت کو محض مورخوں کا ذخیرہ سمجھتا ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں اور عام انسان بھی اپنے جذبات کے ہجوم میں اپنے جذبات کی داد دیتا ہے۔ اسے شاعری یا ادب سے کوئی سروکار نہیں۔

حنیف ! اگر تم کسی دن یہ اعلان کر دو کہ مجھے تو سبز رنگ سرخ نظر آتا ہے تو مصوری کا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا ؟ میرا مطلب ہے کہ میں اگر سبز گھاس کی جگہ سرخ گھاس لکھ دوں تو ہماری روایت کی پرانی حویلی میں ایک کہرام نہ مچے گا؟

---

[۱] احمد ندیم قاسمی - روزنامہ امروز ۱۴ر دسمبر ۶۹ء (حلقہ ارباب ذوق کے سالانہ اجلاس کا خطبہ صدارت قسط ۲)

کیونکہ ان کے خیال میں گھاس سبز ہی ہوتی ہے۔ ویسے سرخ بھی ہوتی ہے۔

ہر دور کو اس سے قبل کے ادوار پر یہ فوقیت حاصل رہی ہے کہ اس کا میدان پہلے سے وسیع تر ہوتا گیا ہے مگر اس حقیقت سے فائدہ اٹھانا ہر دور کے بس میں نہیں۔

روایت کے معنی علم اور تہذیب کی وہ تمام استعداد ہے جو انسان کو آج تک حاصل ہوئی ہے یعنی روایت وہ روح ہے جو کسی عصرِ رواں میں دھڑکتی ہے اور اس روح کا ادراک اپنے زمانے پر نگاہ رکھنے ہی سے ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے ایک پس منظر لازمی ہے۔

زندہ روایت ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کرنا نہیں سکھاتی بلکہ اس کے ذریعے فن کار اپنے مقدر کے ستارے کو پہچان سکتا ہے اور اس کی گردش کو قابو میں لانا انفرادی صلاحیت کے ذریعے ہی ممکن ہے — محض علم حاصل کر لینے سے اگر کوئی شخص فن کار بن سکتا تو بھلے مانس تنقید نگاروں کو کون پوچھتا؟ فن کار اپنے علم کو براہِ راست نہیں اگلتا بلکہ اسے ہضم کرتا ہے اور تخلیقی لمحوں کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ علم حاصل کرنے اور تخلیقی کام کرنے کے درمیان ایک وقفہ بھی ہوتا ہے۔

علم اور تجربے کے سفر کے بعد ذہن تھک جاتا ہے۔ اس تھکن میں سرور کے ساتھ ساتھ ایک بے زاری کی کیفیت بھی ہوتی ہے۔ اس وقفے میں فن کار اپنے علم اور تجربے کو اپنے تصور کی کٹھالی میں پگھلا کر کندن سونا بناتا ہے۔

انفرادیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ روایت کو سرے سے نظر انداز کر دے لیکن وہ روایت ہی خام ہے جس میں انفرادی صلاحیت کے پنپنے کی گنجائش نہیں۔

آج ہم انسانی شعور کے ایک نئے موڑ پر کھڑے ہیں۔ ہمارے مسائل اگلے وقتوں کے لوگوں سے بالکل مختلف ہیں۔ روایت کا بیشتر حصہ جسے لوگ آج تک قابل تقلید سمجھتے رہے ہیں، اپنی تمام خوبیوں کے باوجود ہمارے لیے بے جان اور بے تعلق سا ہو گیا ہے۔ اس لحاظ سے ہمارے لیے روایت کا مسئلہ اپنی پوری اہمیت

کے باوجود ایک ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمارے سامنے انفرادی صلاحیت کا مسئلہ زیادہ اہم ہے۔ میر کا "شب چراغ" تھوڑی دور تک رستہ دکھا سکتا ہے، منزل پر نہیں پہنچا سکتا۔ جو فن کار نئی روایت نہیں بنا سکتا وہ کوئی تخلیقی کارنامہ بھی نہیں کر سکتا۔[1]

اب یہ کسی سوئے ہوئے شخص کے خوابوں کی دھند میں لپٹی لپٹی گفتگو تو ہرگز نہیں۔ یہ آدمی تو کھلی آنکھوں سے جاگ رہا ہے اور آپ ہم سے سچی باتیں کر رہا ہے۔ اپنے خیالات کا غیر مبہم اظہار کر رہا ہے۔ ناصر کاظمی بہت فراخ دل انسان تھے۔ ان میں کسی بھی فن کار کے بارے میں تعصب نہ تھا۔ جہاں تک پسند ناپسند کا تعلق ہے تو یہ کوئی خامی نہیں۔ اس کا سبھی کو حق حاصل ہے۔ لیکن ناصر نے ایسا تو کبھی نہیں کیا کہ اپنے مخالف کو نیچا دکھانے میں بیجا الزام تراشی کی ہو۔ جو بات ان کے نقطۂ نظر سے صحیح ہوتی بلا جھجک کہہ ضرور دیتے تھے۔

ناصر ریڈیو پاکستان لاہور سے منسلک رہے اور یہاں "سفینۂ غزل" کے عنوان کے تحت کئی پروگرام نشر کیے، جن میں مختلف شاعروں اور ادیبوں پر اچھے اچھے مضمون لکھے۔ ابھی یہ مضمون شائع نہیں کیے گئے۔ اگر ان کا انتخاب کتابی شکل میں جمع کر دیا گیا تو ناصر کی اس ناقدانہ نظر کا بخوبی علم ہو سکے جو ان کے دو شائع شدہ مضمونوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ ایک "درد پر" کھے "آم کی تلاش" اور دوسرا "میر پر" بنائے تازہ"۔ میر ناصر کے ہیرو شاعر ہیں۔ انھیں بے حد پسند ہیں اور پسند وہی چیز آتی ہے جو اپنی افتادِ طبیعت سے اور اپنے مزاج سے مطابقت رکھتی ہو۔ میر پر ناصر نے بہت عمدہ مضمون لکھا ہے۔ نہ صرف منصفانہ رائے دی ہے بلکہ اسلوب اتنا پیارا ہے کہ ان کی کی دلیل بھی سمجھ میں آ جاتی ہے اور ان سے اتفاق کیے چلے جانے کو جی چاہتا ہے۔ یوں لگتا ہے ناصر اپنے ایک عزیز ترین شاعر دوست سے ہمارا تعارف کروا رہے ہیں:

"میں نے اگر میر صاحب کو مانا ہے تو بڑے جھگڑے اور فساد کے بعد، شاید اسی لیے

---

[1] ناصر کاظمی "سویرا" ۱۷ - ۱۸ (ایک مکالمہ خوشبو کی ہجرت) ص ۱۹۹ تا ۲۲۰

آپ کی سمع خراشی کرنا چاہتا ہوں ۔ میرا اپنا جیون ساتھی ہے، لیکن ایسا ساتھی جس سے ہر قدم پر جھگڑا رہتا ہے ۔ مدت سے ہم ایک گھر میں رہتے ہیں، ہنستے بولتے ہیں اور روٹھتے منتے رہتے ہیں۔ ان سے میری بچپن ہی میں ملاقات ہوگئی تھی لیکن ان کا تعارف نانا اور والدہ نے کرایا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جوں جوں دن گزرتے گئے رنگ رنگ کے لوگوں سے بنی اور بگڑی ۔ کچھ آرزوئیں مرتیں تو ان کی جگہ نئے ولولے بیدار ہوتے ۔ اب میر کی شاعری میں کسی حد تک مجھے اپنی شخصیت کے کچھ اور نئے پہلو بھی نظر آنے لگے یا یوں کہیے کہ میر صاحب کے کچھ اور رنگوں نے مجھے متوجہ کیا۔[1] اس مضمون میں ناصر نے بڑی ذہانت کے ساتھ میر کے زمانے کی رات کو اپنے زمانے کی رات سے ملایا ہے ۔

" آج کے شاعر کے سامنے پہلے سے بھی کہیں وسیع منظر حیات کھل گیا ہے مگر واقعات کی مماثلت کی وجہ سے میر صاحب کا زمانہ ہمارے زمانے سے مل گیا ہے ۔ وہی غریب الوطنی، وہی قافلوں کا سفر، وہی رہزنی، آئے دن کی حکومت کا بدلنا، خوراک کی قلت، سیلاب کی تباہی اور پرانی اقدار کا بکھر جانا اور رواجِ ہنر اور وفا پیشگی کا اٹھ جانا، غرض یہ حوادث ہمیں بھی دیکھنے پڑے "[2]

پھر ناصر نے میر اور اقبال کے فلسفۂ حیات کی مماثلت کی طرف بھی اشارا کیا۔ " گو اقبال نے میر صاحب کا کہیں ذکر نہیں کیا مگر میر کے یہاں جا بجا ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جو بڑی حد تک اقبال کے فلسفۂ حیات سے مماثل ہیں"[3] " ناصر کاظمی ماضی کے تجربات سے وصل کی آرزو میں میر کے زمانے تک گئے تو ان کے ہاں اقبال کا رنگ مدھم پڑا اور میر کے رنگ پر نئی آب و تاب آئی ۔ ناصر میر کے ہاں رفتگاں کے سراغ میں گئے تھے اس لئے انھیں وہاں جا کر علم ہوا کہ یہاں تو فلسفۂ اقبال کے بنیادی عنصر تہ در تہ سمٹے ہوئے ہیں ۔ " چنانچہ وہ اس سوچ میں پڑ گئے کہ " اقبال اپنے

---

[1] ناصر کاظمی "سویرا" ۱۹-۲۰-۲۱ (جان پہچان) میر تقی میر "بنائے تازہ" ص ۲۶۱-۲۶۲

[2] ناصر کاظمی "سویرا" ۱۹-۲۰ (جان پہچان - میر "بنائے تازہ") ص ۲۷۲

[3] " " " " "

بنیادی فلسفۂ حیات میں میرے اس قدر قریب ہیں، تو کیوں اور کیسے ؟"[1]

ناصر نے صرف میر پر ہی اظہارِ خیال نہیں کیا بلکہ اور بھی شعراء کے متعلق آراء دیں۔ خود اقبال کے بارے میں یوں کہتے ہیں :

" اقبال ان زمینوں کو چھوڑتا ہوا، جس زمین کی تلاش میں سرگرداں رہتا تھا وہ اسے مل گئی ہے ، وہ اس زمین میں ابدی نیند سو رہا ہے اور اس کی آواز اس زمین سے ہو کر سارے عالم میں پھیلتی جا رہی ہے۔ کبوتروں کا شوق تو ایک ضمنی حیثیت رکھتا ہے۔ دراصل اقبال نے انسان سے رشتہ استوار کرنے کے لئے تمام مخلوقات سے دوستی کی۔ جب اسے خیر البشر نے روشنی دکھائی تو وہ انسان کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ انسان کو اس نے کئی روپوں میں دیکھا اور اس نے اپنی شاعری میں اسے جو اسماء عطا کئے ہیں وہ ایک پورا فلسفۂ حیات بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ مثلاً آدم اور ابلیس ، بساطِ حیات کے یہ دو مہرے اسے طاقت کے اسم نظر آتے ہیں اور ساتھ ساتھ ایک دوسرے سے نبرد آزما بھی ۔ ان کی جنگ وجدل اور ہار جیت سے جو روح پیدا ہوتی ہے وہ اسے انسان کے پیکر میں دیکھتا ہے دراصل وہ انسان سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ فطرت کی پوری طرح تسخیر کرے اور آئینِ خداوندی کے تحت اس پوری کائنات کی خلافت کی باگ ڈور سنبھالے۔

" ابلیس اور آدم کا مکالمہ اقبال کے فلسفے کی ایک اہم کڑی ہے۔ اسی طرح چیونٹی اور عقاب کا مکالمہ آدم کی اس منزل کا سراغ دیتا ہے جہاں اس نے اپنے آپ کو انسان کے مرتبے تک پہنچایا اقبال یہاں سے قرآن کی طرف رجوع کرتا ہے اور شاعری کے ذریعے ایک نمائندہ انسان کے اظہار کو جنم دیتا ہے۔"[2]

---

[1] فتح محمد ملک " تعصبات " (غزل اور نئی غزل) ص ۱۵۹

[2] ناصر کاظمی "سویرا" ۱۷ - ۱۸ (ایک مکالمہ " خوشبو کی ہجرت) ص ۲۱۴ - ۲۱۵

غالب کے متعلق یوں کہتے ہیں :

"شیخ صاحب نے غالب کی جو تصرف پسندی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ دراصل وہ صرف غالب ہی تک محدود نہیں وہ تو ہر انسان چاہتا ہے۔ غالب کی یہ معصوم اور عظیم آرزوئیں ہم تک اس لئے پہنچیں کہ ایک چیز اب بھی سر پردہ روایت میں موجود ہے۔ جیسے نسخہ حمیدیہ کہتے ہیں۔ اصلی غالب تو اس نسخہ میں ہے۔ عوامی غالب تو مصوّر اڈیشنوں میں بھی مل جاتا ہے۔ غالب اور حکومت کی ٹکر محض سیاسی نہیں تھی وہ بادشاہ کا استاد یا وزیر بھی نہیں بننا چاہتا تھا بلکہ وہ تو بادشاہ کا رقیب بننے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ بات یہ ہے کہ ہاتھی کی سواری کو اس کا بھی جی چاہتا تھا لیکن ماہر لسانیات کا الزام لینا اسے ہرگز قبول نہ تھا ...... پھر کیا ستم ہے کہ عجم کا ایک سرو رواں بلیماراں کے کوچے میں خاک پھانکتا پھرے اور لال قلعہ میں زاغ و زغن کہرام مچائیں۔" [1]

"...... غالب کا دور وہ تھا جب ایک پوری تہذیب مٹ رہی تھی اس کے حصے میں بھی تلچھٹ آیا تھا لیکن اس نے بڑے وقار سے ساقیِ دوراں کی یہ پیش کش قبول کی ؎

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے" [2]

اور اپنے استاد حفیظ ہوشیارپوری کی شخصیت کے متعلق ایک دلچسپ خاکے میں ان کی غزل پہ یہ بات لکھی: حفیظ کی غزل روایت سے آشنا ہے لیکن اس کا قالب بنا ہوتا ہے۔ دراصل وہ

---

[1] ناصر کاظمی "سویرا" ۱۷-۱۸ (ایک مکالمہ "خوشبو کی ہجرت") ص ۲۱۱-۲۱۲

[2] ناصر کاظمی "نیا دور" ۷-۸ (نیا اسم) ص ۹۵-۹۶

اپنے آپ کو روایت سے کسی طرح بھی الگ نہیں کرنا چاہتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جس زمانے میں حفیظ سے اپنی دوستی ہوئی وہ زمانہ غزل گو شعراء کے لئے بہت بھاری زمانہ تھا۔ بیسیوں میں دو چار کا کہیں کچھ بناؤ تھا، لیکن حفیظ اپنی روش پہ ڈٹا رہا۔ وہ نگیں کی طرح گھر میں گڑ کر بیٹھا رہا اور اس نے گنجِ تنہائی میں رہ کر بڑے حوصلے سے دیوانگی کی۔[۱]"

اور یہ ہے ابنِ انشاء کی "چاند نگر" پر ناصر کا تبصرہ ۔

" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انشا جی افتادِ طبع کے لحاظ سے بے شک رومانوی بلکہ الف لیلوی مزاج کے شاعر ہیں لیکن ان کے یہاں محبت کے سوا نئے زمانے کے سیاسی اور نفسیاتی مسائل بھی ملتے ہیں۔ وہ کافی حد تک ترقی پسندانہ موضوعات کو عزیز رکھتے ہیں لیکن انھیں آنچل کو پرچم بنانے کا شوق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں نعرے بازی نہیں بلکہ دھیمی دھیمی دل کو چھو لینے والی کیفیات ہیں جو سچی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔[۲]"

ناصر اپنی تحریر اور گفتگو میں اُداسی کا عنصر غالب نہیں آنے دیتے۔ بلکہ ان کے ہاں شگفتگی اور خوش طبعی کی لہر ڈوبتی، اُبھرتی رہتی ہے۔

" ایک بار عجیب لطیفہ ہوا۔ میر صاحب کا یہ شعر پڑھا :

میرؔ صاحب رُلا گئے سب کو
کل وے تشریف یاں بھی لائے تھے

شروع ہی سے یہ سکھایا گیا تھا کہ جس سے ملو مؤدبانہ ملو۔ اپنے کو بڑا نہ سمجھو۔ حالانکہ بڑا پننے کی ہوس تو شروع ہی سے ہر انسان کے دل میں چٹکیاں لیتی ہے۔ میرؔ کا یہ شعر پڑھ کر بڑا تاؤ آیا کہ عجیب بے تمیز شاعر ہے۔ اپنے لیے صاحب اور تشریف لائے، ایسے لفظوں کا استعمال روا رکھتا ہے والدہ کے پاس گیا اور نانا ہنس پڑے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

---

۱ ناصر کاظمی "نقوش" شخصیات نمبر (حفیظ ہوشیارپوری) ص ۱۱۰۹

۲ ناصر کاظمی "ہمایوں" اکتوبر ۱۹۵۵ء (مطبوعات) ص ۲۸۳

"اس عرصے میں گاہے گاہے کلیاتِ میر کی ورق گردانی بھی کر لیتا تھا۔ نرم شانہ لڑکوں کا ذکر دیکھتا تو حیا آتی، کفر و الحاد کے شعر پڑھتا تو کانپ جاتا، شمشیر، خنجر، تلوار، تیر، تیر اور کمان ایسے لفظوں سے دم گھٹتا کہ یا اللہ یہ شاعر ہے یا توپ خانے کا داروغہ۔"۔۔۔۔ ؎۱

"یہ بھڑیں فنکار نہیں مگر جو چھتے یہ بناتی ہیں ویسا فن شاید تمہیں کہیں نہ ملے۔ بھڑوں کا نشیمن خود ایک فن پارہ ہے۔۔۔۔۔ میرے بھائی! ہمیشہ ایک سا موسم نہیں رہتا۔ اور بارش ہر روز نہیں ہوتی۔ بھڑیں اگر سال بھر چھتے بنائیں تو جبھی تم انھیں فنکار مانو گے؟ فنکار تو میں نے انھیں ازراہِ جوانمردی کہہ دیا۔ وہ فنکار نہ سہی لیکن ان کے مزاج میں اس ذات کی ایک چاشنی ضرور نظر آتی ہے۔ پہیلی سنو گے!

کالے منہ پہ پیلا ٹیکہ بن مارے وہ روئے

یہ بھڑ کا باپ ہے۔ تم اسے تاگا باندھ کر نہیں اڑا سکتے۔"

"اپنے لیے تو آسمان اور زمین اس وقت تک دو الگ الگ چیزیں تھیں جب تک پتنگ نہ چڑھائی تھی ادھر پتنگ چڑھی اُدھر میں آسمان پر۔ آسمان اور زمین کے درمیان خبر رسانی کا سلسلہ تب سے جاری ہے۔ اب بھی وہی افق ہے اور وہی اڑانیں لیکن پتنگ نظر نہیں آتی۔ تار ابن گئی۔ ڈور البتہ میرے ہاتھ میں ہے۔ اب جنگ سیاروں سے ہے۔ جب ہاتھ ذرا بھاری ہوتے ہیں تو چونکتا ہوں کہ کوئی سیارہ نبرد آزما ہوا چاہتا ہے۔" ؎۲

"اس منظرِ حیات کو جرمن فلاسفر "ولٹن شوانگ" کہتے ہیں۔ باقی انہی سے پوچھیے۔۔۔۔۔"

؎۱ ناصر کاظمی "سویرا" ۱۹۔۲۰۔۲۱ (جان پہچان۔ میر۔ بنائے تازہ)

؎۲ ناصر کاظمی "نیا دور" ۷۔۸ "ایک مکالمہ" نیا اسم)

اور دیکھیئے اپنے محترم استاد کا خاکہ :

" . . . . . سٹیج پہ یوں تو دو تین اور بھی اصحاب تھے لیکن ایک بہت دلچسپ اور عجیب سی چیز بھی تھی گہرا سانولا رنگ، پچکے ہوئے گال، خشک ہونٹ، سرمئی برف سے بال، گہرا جسم، چھوٹی چھوٹی کنچوں سی آنکھیں، کرسی پہ سے اُچکتی ہوئی ہڈیوں کی ایک مالا۔ شاعر مسند پر آکر اپنا کلام سناتا۔ صاحبِ صدر دل بڑھاتے اور داد دیتے۔ لیکن یہ صاحب اپنی حرکتوں میں مگن تھے۔ خود ہنستے اور دوسروں کو بھی ہنساتے۔ شاعر ان کی طرف دیکھتا تو ایک دم سنجیدہ ہو جاتے اور سر کو نفی میں ہلا کر داد دینے لگتے۔

" . . . . . اگلے دن میں سگرٹ لے کر کالج ہوسٹل کی طرف جا رہا تھا کہ وہی عجیب سی چیز ایک میل خور اگرے سا سوٹ پہنے، ٹائی میں ننھی سی گرہ، دونوں ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈالے دکانوں کے بورڈوں کی طرف دیکھتے ہوئے اردگرد کی چیزوں سے یکسر بے خبر کسی کو ڈھونڈتی ہوئی نہ جانے کدھر سے کدھر کو جلدی جلدی چلتی دکھائی دی۔

" . . . . . . اتنے میں دروازے پہ دستک ہوئی۔ میں نے کئی بار کہا کون؟ لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ میں پھر اپنے دھیان میں لگ گیا۔ دستک پھر ہوئی۔ اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ وہی چیز میرے سامنے کھڑی تھی مجھے کچھ ہنسی سی آ گئی لیکن میں ضبط کر گیا۔" [۱]

ناصر کی نثر اور گفتگو پر محمد حسین آزاد کا بہت واضح اثر ہو نہ ہو لیکن ناصر تمثیلوں میں بات ضرور کرتے ہیں۔

" یہ لفظوں کا قبیلہ بھی بڑا خود سر واقع ہوا ہے۔ جب بھی کسی نئے لفظ کی ضرورت ہوتی تو زبان کے خیمے کے باہر للکارنا پڑتا کہ اس لفظ کی روح تو ہمارے خیالوں میں ہے اسے حاضرِ بزم کرو۔ شاعر تو لفظوں کو اس طرح گرفتار کر لیتا ہے جیسے

---

[۱] ناصر "نقوش" شخصیات نمبر (حفیظ ہوشیار پوری)

شیر ہرن کو اپنے پنجے میں دبوچ لے ۔"[1]

"قلم چکی چلائے گا، میں لفظوں اور خیالوں کی مٹھیاں بھر بھر کر ڈالوں گا، جو کچھ پس کر گرتا رہے آپ اسے سمیٹتے رہیں ۔"[2]

ڈرامائی انداز گفتگو کا ایک نمونہ دیکھئے :

" ایک رات میں سوتے سوتے چونک پڑا۔ میرے کمرے کے باہر دو درخت آپس میں بحث کر رہے تھے۔

پہلی آواز : چلو کمرے کے اندر چلیں !

دوسری آواز : نہیں وہاں ہماری برادری نہیں۔ انسان ہمارا دشمن ہے۔

پہلی آواز : تم جنگلی ہو۔ انسان نے ہمیں مہذب بنایا۔ ہم پر احسان کیا۔

دوسری آواز : انسان اور ہم میں کیا قدر مشترک ہے ؟

پہلی آواز : اس مکان کا رہنے والا محض انسان ہی نہیں، فن کار بھی ہے ۔ اس کے اندر بھی ایک سدا بہار درخت ہے ۔ میں نے بارہا اس سے گفتگو کی ہے ۔ دیوار کے شگاف سے جھانک کر دیکھو ! ہماری برادری انسان سے کتنی مانوس ہے ۔ وہ میزیں، کرسیاں، پلنگ اور الماریاں سب درخت تھے ۔ تم انھیں پہچاننے کی کوشش کرو۔

دوسری آواز : تم انسان کے جاسوس ہو ! تم جاؤ میں تو واپس جاتا ہوں ۔"[3]

ناصر عجیب عجیب اور خوبصورت باتیں کرتے ہیں۔ وہی "بلند آواز" میں شعر

---

[1] ناصر کاظمی "سویرا" ۱۷۔۱۸ (ایک مکالمہ۔ خوشبو کی ہجرت) ص ۲۲۰

[2] ناصر کاظمی "سویرا" ۱۹-۲۰-۲۱ (جان پہچان میر و بنائے تازہ") ص ۲۶۳

[3] ناصر کاظمی "سویرا" ۱۷-۱۸ (ایک مکالمہ۔ خوشبو کی ہجرت) ص ۲۲۰

سوچنے" والا انداز :

"لفظ یوں آئیں جیسے کسی نے چراغ جلا کر رکھ دیئے ہیں"

"میں جب تازہ غزل کہتا ہوں تو میر کو بھی سناتا ہوں اور احمد مشتاق کو بھی"

"دریا اس شخص کو بہتا دکھائی دیتا ہے جس کے اندر دریا ہو"

"میں تو اب تھکا ہوا سورج ہوں دیوار تھام کر چل رہا ہوں"

"میں سرسوں کے پھول کو اپنا ہم عصر کہوں گا"

اسی آخری فقرے کی وضاحت اپنے ٹی وی انٹرویو میں وہ یوں کرتے ہیں :

"اصل میں سرسوں کا پھول تو ایک - آپ کو پتہ ہے سرسوں کا پھول کس چیز کا نام ہے وہ بظاہر تو آپ کو ایک پتی سی زرد سی نظر آتی ہے - وہ تو ایک موسم، ایک رنگ، ایک تہذیب کا نام ہے تو وہ پوری تہذیب میری ہم عصر تھی۔ اس لئے کہنے کو یہ فقرہ گویا اس میں "فقرگی" کا شوق ہے، تو سرسوں کے پھول کے ہم عصر کا مطلب ہے کہ سرسوں کے ساتھ جتنی تہذیب اور رنگ اور میلے اور اس کے ساتھ ہرنوں کا چوکڑیں بھرنا اور وہ رنگ میلے ہونا اور وہ زرد زرد موسم اور آسمان و زمین میں قوس قزح کا اترنا۔ اس سارے ہیں . . . میرے پورے عصر کی روح تھی اس میں سے تو، میں نے ایک چیز لے لی - ع

ع خبر بہار کی لایا ہے کوئی گل پارہ

سرسوں کے پھول سے دکھانا مقصود تھا اس پوری دھرتی کو"[1]

تو یہ ہے ناصر کی نثر جس سے صاف طور پر واضح ہے کہ یہ ایک شاعر کی نثر ہے اور اسی لیے اس میں نئے پن اور تازگی کے ساتھ ساتھ ایک منفرد اسلوب ہے - ہمارے لیے غزل گو ناصر کی نثر کی خوبیوں کو جاننا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس طرح ہی ناصر کی شخصیت مکمل ہوتی ہے - کیونکہ باوجود تخیل سے مالامال گفتگو کے اس میں زندگی کی مسکراہٹیں، سچائیاں اور شگفتگیاں سمٹی ہوئی ہیں - یوں

[1] ناصر کاظمی - ٹی - وی انٹرویو

ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اُداس، حیران اور بعد میں تیز دھوپ میں آنکھیں کھول لینے کی ہمت رکھنے والے اس شاعر کے پاس پُراعتماد مسکراہٹیں بھی ہیں۔ خفیف اور دل کو دُکھ نہ دینے والے بلکہ سوچ پر مجبور کر دینے والے طنز بھی ہیں۔ میٹھی میٹھی چٹکیاں ہیں، خوبصورت چھوٹے چھوٹے مگر مکمل فقرے، نئے، حسین، نرم نرم الفاظ۔ ساتھ ہی باوجود شاعرانہ رنگ کے اس میں اتنا زور ضرور ہے کہ اس نثر میں دلیل بھی دی جا سکتی ہے۔ اپنی سوچ اور اپنی رائے کا خوبی سے اظہار بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس میں بے تکلفی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ناصرؔ آپ کے سامنے بیٹھا باتیں کر رہا ہے۔ یوں تو ابھی ناصر کے نثری نمونوں کا کوئی مجموعہ اور ان کی ڈائریاں شائع نہیں ہوئیں لیکن اگر ایسا کیا گیا تو ایک دلچسپ اور منفرد اندازِ تحریر اور ایک انفرادیت رکھنے والے شاعر کی واضح سوچ سامنے آئے گی۔ یوں تو ناصر کی انگریزی سے ترجمہ شدہ صحیح کتاب "امریکی سوسائٹی" شائع ہو چکی ہے لیکن اصل ناصرؔ اپنی طبع زاد تحریروں میں سے ہی جھانکتا ہے۔

اور اب آیئے آخر میں ناصر کی باتیں سُنیں جو صرف الگ سی سوچ رکھنے والے شاعر ہی نہیں، ایک شفیق دوست بھی ہیں:۔ "ادیب، شاعر کو ایک بات سے پہچانتا ہوں بلکہ کئی باتیں ہیں لیکن چلیئے ایک نشانی بتا دوں تمہیں۔ آپ سورج کو کیسے پہچانتے ہیں۔ ایک طرف سے نکلتا ہے، ایک طرف ڈوبتا ہے یہی نا۔ ذرا مجھے کوئی آدمی زیادہ کامیاب نظر آئے تو میں اس کے ادب ددب پر شک کرنے لگ جاتا ہوں۔ ذرا زیادہ ہی کامیاب زندگی میں۔ اور آپ دیکھیئے کہ شاعر کے علاوہ بھی بہت سے لوگ ہیں جو مختلف شعبوں میں پڑے ہیں اور وہ شاعر ہیں، تخلیقی لوگ ہیں۔ ننھے ننھے مزدور۔ میں نے تو دفتروں میں بعض کلرکوں کو دیکھا ہے اور بعض ریڈیو میں، بعض اِدھر اُدھر اداروں میں۔ وہ بڑے تخلیقی لوگ ہیں۔ وہ بڑے خاموش خادم ہیں۔ اس سے بڑا کون شاعر ہے انجن ڈرائیور سے بڑا جو کتنے ہزار اور کتنے سو مسافروں کو لاہور سے کراچی لے جاتا ہے اور کراچی سے واپس لاتا ہے۔ مجھے یہ آدمی بہت پسند ہے اور ایک کانٹے والا۔ پھاٹک بند کرنے والا۔ یہ بھی شاعر ہیں میری برادری کے لوگ۔ اپنا اپنا ROLE ہے۔ آپکو پتہ ہے اگر وہ پھاٹک کھول دے، گاڑی جب آرہی ہو تو کیا قیامت آئے۔ بس شاعر کا بھی یہی کام ہے کہ کس وقت پھاٹک بند کرنا ہے کس وقت کھولنا ہے۔"[1]

---

[1] ناصر کاظمی۔ ٹی وی انٹرویو ۱۹۷۲ء

(چھٹا باب)

ہر دور کی غزل میں میرا نشاں ملے گا

اتنے اعتماد سے اتنا بڑا دعویٰ کرنے والا کون ہے؟ یہ ہیں ناصر کاظمی، اور انہوں نے جو کچھ کہا ہے اس میں شاید ہی کسی کو شبہ ہو۔ بات صرف اتنی سی نہیں کہ میری غزل زندہ رہے گی۔ اس کا محرک تو وہ جذبہ ہے جو ایک فن کار کو اتنی وسعت دے دیتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو نہ صرف صدیوں پہلے کے آئینوں کا عکس بنا دیکھتا ہے بلکہ آئندہ کتنے ہی زمانوں میں اپنے آپ کو ان آئینوں میں اترتا ہوا محسوس کرتا ہے:

شعر کہنے کا مزہ جب ہے کہ صدیوں تک ندیمؔ
آئینے بنتے چلے جائیں مرے اشعار سے
(ندیمؔ)

اسے اپنی جسمانی فنا کا خیال بھی نہیں رہتا۔ ہو بھی کیسے؟ وہ تو زندہ تھا اور زندہ رہے گا۔ یہ جو ناصر کاظمی نے کہا تھا کہ "میں اپنی غزل میرؔ کو بھی سناتا ہوں اور احمد مشتاق کو بھی"[1] تو انہوں نے حال کے علاوہ ماضی تک میں اپنی موجودگی کی خبر دی تھی اور پھر یہ کہہ کر آئندہ مستقبل کے ساتھ بھی چلنے لگے تھے کہ "میرؔ تو خیر ہمارے ماضی کا ورثہ ہیں، میں تو اسلم انصاری کو بھی اپنا ہم عصر سمجھتا ہوں جس نے مجھ سے پندرہ سال بعد لکھنا شروع کیا۔

---

[1] ناصر کاظمی۔ رسالہ "ادب لطیف" نومبر ۱۹۶۲ء (میرا ہم عصر) ص ۔ ۷

جب وہ یہ کہتا ہے کہ اتنے سارے لوگ ہیں اور میں تنہا ہوں، تو میری تنہائی جاگ اٹھتی ہے[۱]،
اسی لئے جب انتظار حسین ٹی۔وی انٹرویو میں ان سے سوال کرتے ہیں کہ بلھے شاہ، کبیر، سورداس
میرا بائی۔ ان شاعروں سے تمہارا کیا رشتہ ہے تو ناصر جواب دیتے ہیں:

اصل میں، شاعر جو، جتنے بھی دنیا میں موجود ہیں، سرمایہ ہیں سب کا۔ کسی جغرافیائی حدود میں بند نہیں، مجھے تو سپین کا شاعر لورکا (Lorca) بھی پسند ہے۔
Garcia Lorca - اور تمہیں پتا ہے کہ میں اسے ایسے پڑھتا ہوں جیسے میرؔ۔ میرؔ کا ذکر اس لیے کرتا تھا کہ ایک خاص فضا میں، پاکستان بننے کے بعد میرؔ کے کلام کی گویا ایک Reievance سی ہو گئی تھی۔ مگر میں نے ان شاعروں کو اس لیے پڑھا کہ وہ مجھے اتنے پسند تھے کہ یوں لگتا تھا کہ یہ کلام یا تو میرا ہے یا مجھے لکھنا چاہیے تھا۔ میں تو انہیں اپنا ہم عصر سمجھتا ہوں، خواہ وہ میرا بائی ہوں، خواہ وہ لورکا ہو، خواہ وہ کالی داس ہو۔ خواہ وہ رامبو ہو۔ تو یہ تو سارے میرے ہم عصر گزرے ہیں۔[۲]

یوں جب ناصرؔ ہر دور کی غزل میں اپنی موجودگی کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر غزل گو کے کلام کو اپنا کلام سمجھتے ہیں اور اپنے کلام کو ان کا حصّہ جانتے ہیں۔

ناصرؔ کی خوبصورت غزل کی بنیادیں مضبوط کرنے میں ان کی روایت پسندی (نہ کہ روایت پرستی) کو کافی دخل ہے۔ ناصرؔ کو ماضی بہت عزیز ہے۔ صرف اس لئے نہیں کہ ان کا اپنا ذاتی ماضی بہت شاندار تھا بلکہ اس لئے کہ وہ جانتے تھے، انہیں اس کا احساس اور شعور تھا کہ ان تک چل کر آنے والے زمانے کے پاس صدیوں کا تجربہ تھا۔ یہ تہذیب، اس

۱؎ ناصر کاظمی۔ رسالہ "ادب لطیف"، نومبر ۱۹۶۲ء (میرا ہم عصر)، ص۔ ۶

۲؎ ناصر کاظمی۔ ٹی۔وی انٹرویو۔ ۱۹۷۲ء انٹرویو لینے والے تھے انتظار حسین

کی قدریں یہ سب کچھ صدیوں کے تجربات سے بنے سانچوں میں ڈھل کر آرہی تھیں۔ یوں شاید عام حالات میں ان کی اہمیت کا احساس نہ ہوتا لیکن جب سب کچھ کے کھو جانے کا ڈر پیدا ہوا اور یوں لگا کہ متاع چھنی جارہی ہے تو تب احساس ہوا کہ" پاکستان نے بے شک بہت ترقی کی ہے۔ وہ بے سروسامانی کی منزل سے گزرا اور ساز و سامان پیدا کیا۔ بنجر زمینوں میں گل و گلزار کھلے۔ کارخانے قائم ہوئے۔ تجارت نے فروغ پایا۔ مختصر یہ کہ زندگی کا ایک نیا نقشہ قائم ہو گیا۔ سن سنتالیس کو دھیان میں لاؤ اور نئے نقشے کو دیکھو۔ دنیا کتنی نئی ہے مگر پھر مجھے یہ اتنی پرانی کیوں نظر آتی ہے۔ کون سی شے گم ہو گئی ہے کہ ہم نے نئی دنیا بنا کر بھی دیکھ لی اور وہ فوراً پرانی نظر آنے لگی۔ حال کا حال بے حال ہے۔ ۔ ۔ حال کو دیکھنے کے لیے دو آنکھیں ہیں۔ ماضی کی یادیں اور مستقبل کے خواب۔ مگر اب ہماری دونوں آنکھوں کی بینائی شاید کم ہو گئی ہے۔ ماضی کی یادیں دھندلا گئی ہیں مستقبل کے خواب منتشر ہو گئے ہیں[۱]۔ تب ناصر نہ صرف ماضی کی روایت کی تصویر اتارنے کے لئے تیار ہوتے بلکہ اس تصویر میں مستقبل کے خوابوں اور نئی روایتوں کے رنگ بھرنے کی بھی سوچی ان کے نزدیک "۔ ۔ ۔ زندہ روایت ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم نہیں سکھاتی بلکہ اس کے ذریعے فن کار اپنے مقدر کے ستارے کو پہچان سکتا ہے اور اس کی گردش کو قابو میں لانا انفرادی صلاحیت کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ انفرادیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ روایت کو سرے سے نظر انداز کر دے لیکن وہ روایت ہی خام ہے جس میں انفرادی صلاحیت کے پنپنے کی گنجائش نہیں۔ ۔ ۔ جو فن کار نئی روایت نہیں بنا سکتا وہ کوئی تخلیقی کارنامہ بھی نہیں کر سکتا[۲]"

---

[۱] ناصر کاظمی۔ ٹی۔ وی انٹرویو۔ ۲-۷-۶ انٹرویو لینے والے تھے انتظار حسین۔

[۲] ناصر کاظمی۔ رسالہ "سویرا" ۱۷-۱۸ (ایک مکالمہ۔ خوشبو کی ہجرت) ص ۱۹۹ تا ۲۲۰

تب نئی روایت بنانے کے لئے سب سے پہلے تو ناصر نے اپنے ماضی کے سرمائے کے لعل و گوہر کی شناخت کی۔ "ناصر کاظمی ماضی کے تجربات سے وصل کی آرزو میں میرؔ کے زمانے تک گئے تو ان کے ہاں اقبال کا رنگ مدھم پڑا اور میرؔ کے رنگ پر نئی آب و تاب آئی"[1] پھر ناصر نے حال کے تجربات کو حاصل کرنے کا کرب سہا اور پوری سچائی، سادگی اور خلوص کے ساتھ ان کا اظہار کر دیا۔ ناصر کی غزل سے کچھ عرصہ پہلے اُردو غزل کے اشعار جذبہ و احساس، حتیٰ کہ فکر تک کی سچائیوں کے بے ساختہ مگر فن کارانہ اظہار سے زیادہ تر محروم نظر آتے ہیں اس لئے کہ اس سب کچھ کو پورے انصاف کے ساتھ اس وقت نظم میں برتا جا رہا تھا اور کچھ کو چھوڑ کر بیشتر، غزل کو محض "تفریحی صنف سمجھتے تھے اور یا پھر انہوں نے اظہار پر پابندیوں سے مجبور ہو کر غزل کو اپنایا تھا۔ ناصر کاظمی کی غزل گوئی کی ابتدا اور حیرت انگیز ترقی کا زمانہ بھی یہی ہے۔ نئی غزل کی تاریخ میں ناصر کاظمی کا یہ کارنامہ یادگار رہے گا کہ انہوں نے ہر دو رویوں کو رد کر کے ایک نئے رویّہ کو جنم دیا۔۔۔۔ وہ یہ احساس لے کر اٹھے کہ جب تک غزل اہم ترین صنف سخن نہیں بن جاتی، ملک سخن کا سماں سنسان رہے گا"[2]

ناصر کاظمی نے ہجرت کے تجربات، ماضی کی یادوں، اپنے جذبہ و احساس کی نرم تہوں اور اپنی سوچ کی دھیمی لہروں کو تغزل کی اعلیٰ خصوصیات اور مانوس مگر بالکل نئے طرز بیان کے ساتھ اس طرح پیش کیا کہ اُردو غزل میں ایک نئے، بلند، مضبوط اور روشن مینار کا اضافہ ہو گیا جس کی شعاعوں نے غزل کے میدان میں بکھرے اس وقت کے اندھیروں میں بہتوں کو راہیں دکھائیں۔ بے شک اور بھی شاعر اس وقت غزل کہہ رہے تھے اور کئی شعرا نے اُردو غزل میں اپنا مقام بھی بنانا شروع کر دیا تھا مگر ایک نئی چیز، ایک مضبوط اور

1ـــہ فتح محمد ملک "تعصبات" (غزل اور نئی غزل)، ص۔ ۱۵۹

2ـــہ ایضاً ص۔ ۱۵۶۔ ۱۵۷

الگ سی آواز کا احساس اس وقت صرف ناصرؔ ہی دلا رہے تھے۔" ناصرؔ کاظمی ایک اچھا غزل گو نہیں تھا ایک عظیم غزل گو تھا عین اس دور میں جب صنفِ غزل اپنی بعض پابندیوں اور حد بندیوں کے باعث دوسری اصنافِ سخن کے مقابلے میں دبنے لگی تھی، ناصرؔ غزل ہی کا علَم بلند کر کے اٹھا اور اپنی جیتی جاگتی شاعری سے غزل کے وقار کو بحال کیا۔ غزل میں عصری رویوں کا انعکاس تو علامہ اقبالؔ کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا اور ترقی پسند ادب کی تحریک نے بھی غزل کو کئی وسعتوں سے متعارف کرایا مگر ناصرؔ کے پاس اظہار کا جو دل آویز سلیقہ تھا وہ جدید ہوتے ہوئے بھی غزل کی فضا سے ہم آہنگ تھا۔ ناصرؔ کی جدّت غزل کی روایت ہی سے پھوٹی تھی اس لئے ناصرؔ اور اس کے قاری کے درمیان وہ فاصلہ کبھی حائل نہ ہوا جو آج کتنے ہی جدید شعرا اور اُن کے قارئین کے درمیان حائل ہے اور نتیجہ جس کا یہ ہے کہ شعر و ادب کا قاری معاصر شعر و ادب سے بدظن ہو رہا ہے۔ جب تک فن مفہوم کی ترسیل کا فریضہ ادا نہیں کر پاتا، وہ اپنے وجود کا کوئی جواز پیش کرنے سے بھی قاصر ہے۔ ناصرؔ کاظمی کی غزل اس حقیقت کی ایک بلیغ مثال ہے کہ فن بظاہر سادگی کے باوجود بلیغ اور مفہوم سے مملو ہو سکتا ہے۔ غزل کو اتنا سادہ رکھ کر اتنی دور کی، اتنی گہرائی کی باتیں کہہ جانا، اُردو کے جدید غزل گو شعرا میں سے صرف ناصرؔ کاظمی کا کام تھا۔ یوں سمجھیے کہ ناصرؔ کے ہاں میرؔ، مصحفیؔ غالبؔ، مومنؔ اور فراقؔ کے اپنے اپنے منفرد حسنِ ادا ایک دوسرے میں گھُل مل گئے ہیں اور لُطف کی بات یہ ہے کہ غزل کی روایت کے اس احترام کے باوجود ناصرؔ کا ایک اپنا انفرادی اسلوب ہے اور جدید غزل کے موجودہ رجحانات کے پیشِ نظر ناصرؔ کا یہ اسلوب ناقابلِ تقلید معلوم ہوتا ہے[1]۔"

دراصل ناصرؔ سچ بولے۔ آخر تک جو کچھ انہوں نے محسوس کیا، جو ہلچل ان کے اندر مچی، جو

---

[1] احمد ندیم قاسمی۔ رسالہ "فنون" اپریل مئی ۱۹۷۲ء (حرفِ اوّل) ص ۳

سوچیں انہیں آئینہ ان سب کا بلا تکلّف سچائی سے اظہار کر دیا اور حق بات پہ گرد بیٹھ ہی نہیں سکتی، اس کی چمک اپنی جھلک زمانوں تک دکھاتی رہتی ہے۔ سو ناصر کے اشعار پرانے نہیں ہو سکتے۔ چاہے ان میں ہجرت کے تجربات کا خوبصورت بیان ہو:

جنگل میں ہوئی ہے شام ہم کو : بستی سے چلے تھے منہ اندھیرے

یا رات میں چاند نکل آئے:

اوّلین شبِ گلشن کس قدر سہانی تھی

اجنبی مہک پا کر ہم نکل پڑے گھر سے

یا اپنے محبوب کی یاد ہو:

میری ساری عمر میں : ایک ہی کمی ہے تو

یہ سب ایسی تصویریں ہیں جن کے رنگ ابھی تک گیلے ہیں۔ ناصر کی غزل کے شروع میں "اداسی" اور آخری دور میں "امید"، یہ دونوں مختلف رویے ناصر کی شخصیت کے دونوں رُخ دکھا کر اسے مکمل کر دیتے ہیں۔ ناصر جہاں ایک طرف یہ کہتے ہیں کہ:

بیٹھے بیٹھے برس پڑی آنکھیں : کر گئی پھر کسی کی آس اُداس

بھری دنیا میں جی نہیں لگتا : جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی

جہاں میں یوں تو کیسے چین ہے مگر پیارے : یہ تیرے پھول سے چہرے پہ کیوں اُداسی ہے

او پچھلی رت کے ساتھی : اب کے برس میں تنہا ہوں

رنج سفر کی کوئی نشانی تو پاس ہو
تھوڑی سی خاکِ کوچۂ دلبر ہی لے چلیں

اس شہرِ بے چراغ میں جائے گی تو کہاں
آ اے شبِ فراق، تجھے گھر ہی لے چلیں

تو وہیں یہ اشعار بھی ان ہی کے ہیں:۔

وقت اچھا بھی آئے گا ناصرؔ : غم نہ کر، زندگی پڑی ہے ابھی

چہرہ افروز ہوئی پہلی جھڑی ہم نفسو شکر کرو
دل کی افسردگی کچھ کم تو ہوئی ہم نفسو شکر کرو

اتنے دکھوں کی تیز ہوا میں : دل کا دیپ جلا رکھا ہے

ایسا بھی کوئی سپنا جاگے : ساتھ مرے اک دنیا جاگے

اس طرح کے اشعار اگر کسی غزل گو نے پہلے کہے تو وہ فراقؔ ہیں۔ فراقؔ جدید غزل کی بڑی آوازوں میں سے ایک ہیں اور نئی نسل کے شعرا ان سے کئی مختلف انداز سے اثر لیتے رہے ہیں۔ ناصرؔ نے فراقؔ سے اپنے کسی "رشتے" کا ذکر نہیں کیا لیکن انہیں فراقؔ پسند ضرور تھے اور اس کی ایک وجہ یہی ہے کہ فراقؔ بھی جب ماضی کی طرف دیکھتے ہیں تو میرؔ سے ہی اپنا واپسی کا سفر شروع کرتے ہیں۔ ناصرؔ پر فراقؔ کا اثر خصوصاً عشقیہ اشعار میں زیادہ ہے لیکن ناصرؔ بھی فراقؔ کی طرح کئی شعرا کی آوازوں کی سُر اپنی ایک آواز میں تحلیل کرتے گئے۔ یوں وہ اپنی انفرادیت کو مجروح کرنے کے مجرم نہ ٹھہرے بلکہ اس طرح بھی ان کے منفرد ہونے کی حقیقت مزید روشن ہوئی۔

عشق کا موضوع غزل کے لئے لازمی سمجھا جاتا ہے۔ اب چاہے یہ عشق حقیقی ہو یا عشق مجازی یا پھر کسی بھی چیز کا عشق ہو، وہ غزل کے حسن میں اضافہ کا باعث ہوتا ہے۔ میرؔ کو تو عشق حقیقی کے ابھرنے اور قائم رہنے کے لئے سازگار ماحول میسّر تھا اور وہ جب اپنے مجازی عشق کی ناکامیوں سے گھبراتے تو عشق حقیقی میں پناہ لیتے۔ لیکن ناصرؔ کو جب محبّت میں ناکامی ہوئی تو وہ راتوں کو جاگنے لگے اور انہوں نے اس طرح سے سچائیوں کو پانے کی کوشش کی:

ترے بغیر بھی خالی نہیں مری راتیں
ہے ایک سایہ مرے ساتھ ہم نشیں کی طرح

اسی لئے تو انتہائی اُداسیاں اور ناکامیاں انہیں ایسا شعور دے گئیں کہ وہ دوسروں کے دکھوں اور غموں سے پیٹھ موڑ کر نہ بیٹھ رہے بلکہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے غم زدوں کے قریب جا پہنچے اور اپنے اندر کی تمام ہمدردیوں، خلوص، پیار اور محبت سے انہیں دیکھنے لگے۔ ایسی خاموشیاں گونگی نہیں ہوتیں، بولتی ہیں، بہت کچھ کہتی ہوئی، سمجھاتی ہوئی، تسلی دیتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں اور یہ بھی بتاتی ہیں۔ "بھئی تم اکیلے تو اُداس نہیں ہو۔ میں جو ہوں، میں بھی تو ہوں تمہارے ساتھ! چلو آؤ مل کر مسکرانے کی کوشش تو کریں؟!"

جو دل دکھا بھی تو ہونٹوں نے پھول برسائے : خوشی کو ہم نے شریکِ ملال کر رکھا

تو یوں ان کا عشق ان کے دل میں وہ روشنی بسا گیا جس کی کرنوں میں ناصرؔ نے ساری کائنات اور ساری انسانیت کو جھلملاتے دیکھا۔ تب وہ محبّت و محبوب سے متعلق اشعار کے ساتھ ساتھ کائنات اور فطرت کی محبوب چیزوں کو گلے سے لگاتے ہوئے اشعار بھی کہتے ہیں۔ اس طرح فطرت محبوب کے حسین تصوّر اور یاد کو قائم رکھنے والی بن گئی:

ہوائے صبح نے چونکا دیا یوں : تری آواز جیسے دل سے گزری

لے اُڑی سبزۂ خودرو کی مہک : پھر تری یاد کا پہلو نکلا

وہ ستارا تھی کہ شبنم تھی کہ پھول : ایک صورت تھی عجب یاد نہیں

یوں ان کی اُداسی محبوب کی یاد کے راستے ہوتی ہوتی فطرت میں پہنچی۔ پھر وہاں سے کائنات میں پھیل گئی اور تب ناصرؔ کو معلوم ہوا کہ :۔

دھوپ سے چہروں نے دنیا میں : کیا اندھیر مچا رکھا ہے

ناصرؔ کے جذبہ و احساس و فکر کو یہ خبر پہنچی تو ان کی اُداسی بھی معنی خیز بن گئی :۔

اُداس پھرتا ہوں جس کی دھن میں برسوں سے
یونہی سی ہے وہ خوشی، بات وہ ذرا سی ہے

چہکتے بولتے شہروں کو کیا ہوا ناصرؔ
کہ دن کو بھی مرے گھر میں وہی اُداسی ہے

انہوں نے خبردار کیا :۔

ہیں گھات میں ابھی کچھ قافلے لٹیروں کے
ابھی جمائے رہو مورچے کنارے پر

ہوائے ظلم یہی ہے تو دیکھنا اک دن
زمین پانی کو، سورج کرن کو ترسے گا

تب ناصرؔ نے دعا مانگی :۔

عمر بھی کی نواگری کا صلہ : اے خدا کوئی ہم نوا ہی دے
بستیوں کو دیئے ہیں تو نے چراغ : دشت دل کو بھی کوئی راہی دے

اور آخر یوں ہوا کہ :۔

بدلتا وقت یہ کہتا ہے ہر گھڑی ناصرؔ

کہ یادگار ہے یہ وقت انقلابوں میں

یہ وہی ناصرؔ ہے جسے ٹھہرے ٹھہرے مناظر اور ساکن لمحے بھاتے تھے۔ اب اسے زندہ متحرک چیزوں سے لگاؤ ہو گیا۔ کئی ناقدین کے لئے یہ ناصرؔ پسندیدہ نہ ٹھہرا۔ اس لئے کہ انھوں نے اپنے ذہن میں "برگِ نے" والا ناصرؔ بسا رکھا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ بس وہی تصور ساکن ہو جائے۔ کوئی نیا رنگ ہو بھی تو اسی تصویر کے نقوش کو واضح کرنے کے لئے لگایا جائے۔ حالانکہ یہ تصویر نہیں تھی، یہ تو ناصرؔ تھا۔ ایک انسان، ایک خالق۔ انہیں تو وقت کے ساتھ ساتھ آگے قدم اٹھانا ہی تھے۔ وہ جب اپنی ذات سے باہر نکل آئے اور خدا کی طرف سے بخشے گئے سونے کے ذرات سے اپنے فن کی دنیا کو سنہرا کرنے لگے، اسے سچائی کی دھوپ دینے لگے، اردگرد کی تلخ و شیریں اور مکروہ اور حسین چیزوں کی آنکھوں میں اپنی نظروں کی روشنی اتارنے لگے تو کہا گیا:

"اس وقت تک ناصرؔ کی غزلوں کا دوسرا مجموعہ منظرِ عام پر نہیں آیا لیکن اس دوران میں ان کا جو کلام رسالوں کے ذریعے ہمارے سامنے آ رہا ہے اس کی بنا پر یہ کہنا شاید غلط نہ ہو گا کہ "برگِ نے" کے بعد ناصرؔ کی شاعری ارتقا کی بجائے انحطاط کا رستہ طے کرتی رہی ہے۔ ان کی شاعری جو گہرے تجربات سے پہلے بھی زیادہ بہرہ ور نہ تھی، اب گہرے تجربات سے اور زیادہ تہی دامن ہو چکی ہے۔ ان کی موجودہ شاعری کی بنیاد بڑی حد تک ہلکی پھلکی رومانی یادوں پر ہے جن کے بیان میں وہ اس بات کا لحاظ نہیں رکھتے کہ عشق سے متعلق جتنی معمولی معمولی باتیں عاشق کو عزیز ہوتی ہیں، ضروری نہیں کہ عاشق کی غزلیں پڑھنے والوں کو بھی وہ اتنی ہی عزیز ہوں۔ شاعر سے قاری کی توقع یہ ہوتی ہے کہ وہ یا تو انسانی تجربات کے گہرے اور انوکھے پہلوؤں کو بیان کرے یا معمولی باتوں کو غیر معمولی اسلوب میں ظاہر کرے۔"[۱]

---

[۱] نظیر صدیقی۔ رسالہ "فنون" جدید غزل نمبر ۶۹ء (جدید غزل۔ پاکستان اور ہندوستان میں)

پہلے تو ناصرؔ کا جواب سُن لیجئے:۔

"برگِ نے" کے بعد دراصل میری شاعری کا جو ایک لحاظ سے بہتر اور زیادہ تخلیقی دور ہے، میرے خیال میں وہ ـــــ اتنا خوب صورت دَور تو نہیں لیکن وہ "برگِ نے" کے بعد ہی شروع ہوا۔ میں "برگِ نے" کے بعد لکھتا رہا اور لکھنے کی کوشش کرتا رہا مگر چھپنا کم رہا ہوں۔ پھر یہ بھی تو ہے کہ وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ بھئی "برگِ نے" کے بعد میں خاموش ہوں تو وہ خود اصل میں لاپتا ہیں"۔

یہ کتنا ستم ہے کہ ایک ہم عصر نقاد کو جو خود بھی غزل کہتا ہے، ناصرؔ کا ارتقا اس کا انحطاط دکھائی دینے لگا۔ اب یہ اشعار دیکھئے کیا ان میں بہت گہرے نہ سہی۔ گہرے جذبات کی کمی ہے:۔

کچھ اس ادا سے اُڑا جا رہا ہے ابلقِ رنگ
صبا کے پاؤں ٹھہرتے نہیں رکابوں میں

یہ گنہگاروں کی سرزمیں، ہے بہشت سے بھی سوا حسیں
مگر اس دیار کی خاک میں سببِ نمو کوئی اور ہے

بنے بنائے ہوئے راستوں پہ جا نکلے
یہ ہم سفر مرے، کتنے گریز پا نکلے

ہستی کا بھرم کھول دیا ایک نظر نے
اب اپنی نظر میں ہیں جہاں اور طرح کے

---

[1] ناصر کاظمی۔ ٹی وی انٹرویو ۱۹۷۲ء

اور عشق سے متعلق اگر شاعر "معمولی معمولی" باتیں کر رہا ہے تو عرض یہ ہے کہ عشق میں کوئی معمولی بات تو ہوتی ہی نہیں۔ بس شرط یہ ہے کہ صحیح معنوں میں عشق کیا گیا ہو اور اس عشق کے گداز سے زندگی کو نکھار اور سنوار اگیا ہو جیسا کہ ناصر نے نکھارا اور سنوارا۔ اب شعر ناصر یہ کہتا ہے کہ :۔

نئے کپڑے بدل کر جاؤں کہاں اور بال بناؤں کس کے لئے
وہ شخص تو شہر ہی چھوڑ گیا میں باہر جاؤں کس کے لئے

تو اس میں "معمولی پن" یہی ہے نا کہ یہ آج کا عاشق ہے جس کی خودکشی کا یہی انداز ہے نہ کہ تیشے سے سر پھوڑ کر جان دے دینے والا قصہ ہے۔ اب یہ یادیں دیکھئے۔ کیا یہ "ہلکی پھلکی یادیں" ہمارے دل کی انتہائی نازک تاروں کو مضراب بن کر چھو نہیں جاتیں؟

وہ جس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر سفر کیا تو نے منزلوں کا
تری گلی سے نہ جانے کیوں آج سر جھکائے گزر گیا وہ

وہ دوستی تو خیر اب نصیبِ دشمناں ہوئی
وہ چھوٹی چھوٹی رنجشوں کا لطف بھی چلا گیا

تو جیسے مرے پاس ہے اور محوِ سخن ہے
محفل سی جما دیتی ہیں اکثر تری یادیں

پھر ناصر کے نزدیک تو :۔

ذرا سی بات سہی تیرا یاد آ جانا
ذرا سی بات بہت دیر تک رلاتی تھی

یوں کس طرح کٹے گا کڑی دھوپ کا سفر
سر پہ خیالِ یار کی چادر ہی لے چلیں

عشقیہ شاعری کی بنیاد اگر ان "معمولی معمولی" باتوں پر نہ ہو تو عشقیہ شاعری کا کوئی جواز ہی نہیں رہتا۔ یاد رکھیئے کہ ناصر کا عشق مولانا رومؔ اور علامہ اقبالؔ کے عشق سے سراسر مختلف عشق ہے۔ یہ میرؔ اور مصحفیؔ، مومنؔ اور فراقؔ کا عشق ہے اور اس عشق کی بنیاد نہایت نازک (معمولی؟) جذبات و احساسات پر ہی ہوتی ہے۔ عشقیہ شاعری کرنے والے کا تو کمال ہی یہی ہے کہ وہ ان جذبات و احساسات کو زبان دیتا ہے اور جب وہ بولتا ہے تو پوری نوعِ انسانی کی ترجمانی کرتا ہے۔ ناصر نے اسی ترجمانی کا حق ادا کیا ہے۔ کیا ناصر کی یہ سوچ ہم سب انسانوں کی سوچ نہیں ہے؟

آج دیکھا ہے تجھ کو دیر کے بعد : آج کا دن گزر نہ جائے کہیں

آیئے اب یہ بھی دیکھتے چلیں کہ ناصر کی غزل نے نئی نسل کو کس طرح متاثر کیا۔ بات یہ ہے کہ ناصر کی باتیں بظاہر قدیم طرز میں تھیں لیکن ان کے مفہوم میں آج کا زمانہ بولتا تھا۔ اس لئے آج کے نوجوان انہیں اپنی ہی باتیں سمجھتے تھے۔ پوری جدید اُردو غزل میں ناصر کا رنگ اور لہجہ نمایاں ہے۔ اسی لئے فتح محمد ملک یہ کہتے ہیں:۔

"احمد ندیمؔ قاسمی کا طرزِ فکر اور ناصر کاظمی کا طرزِ احساس غنیمت ہے کہ ان کے دم سے نئی اُردو غزل کا وقار زندہ ہے۔" یوں ہماری موجودہ غزل نے جن جن روشن میناروں کی کرنوں میں راہیں پائیں۔ ان میں فراقؔ، فیضؔ اور ندیمؔ کے ساتھ ساتھ ناصر کا مینارِ غزل بھی شامل ہے بلکہ ترقی پسندوں کے ساتھ ساتھ جو دوسرا مدرسۂ فکر یا طرزِ فکر چل رہا تھا۔ اس کے واحد نمائندہ غزل گو ناصر ہی ٹھہرتے ہیں۔ ان کی انفرادیت کے سچے جذبات، ان کی صحیح سوچ نے نوجوان نسل کو بہت متاثر کیا۔"

انفرادی لحاظ سے اگر احمد مشتاقؔ کو ناصر کاظمی کے فن کا صحیح وارث قرار دیا جائے تو

بے جا نہ ہوگا جس طرح ناصرؔ نے میرؔ سے اقبالؔ و فراقؔ تک غزل کی روایت کی سب روشنیاں اپنے اندر جذب کر لی تھیں۔ بعینہٖ احمد مشتاقؔ نے بھی غزل کی اس روایت کا احترام کیا ہے اور اس روایت میں ناصرؔ کاظمی کو شامل کر کے اسے قبول کیا ہے۔ احمد مشتاقؔ، ناصرؔ کاظمی سے ذرا بعد کا شاعر ہے اس لئے احمد مشتاقؔ کے ہاں ناصرؔ کے مقابلے میں عصری رویوں اور جدید محسوسات کی جھلکیاں زیادہ ہیں اور الفاظ کے چناؤ میں بھی اس نے ناصرؔ سے زیادہ اجتہاد سے کام لیا ہے، ورنہ ناصرؔ کے رنگِ غزل کا صحیح انعکاس احمد مشتاقؔ کے ہاں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اسی طرح ظفر اقبالؔ کے دورِ عروج کی غزل میں بھی ناصرؔ شعر شعر سے جھانکتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعد میں ظفر اقبالؔ لسانی تشکیلات کے چکر میں پھنس کر اپنا بہت کچھ گنوا بیٹھا۔ شکیبؔ جلالی بھی ایک ایسا غزل گو ہے جس کے ہاں فراقؔ اور ناصرؔ کے واضح اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ مگر شکیبؔ، فراقؔ و ناصرؔ کے علاوہ ندیمؔ سے بھی متاثر ہے اس لئے اس کے ہاں دونوں رویوں کا ایک دلآویز توازن ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ شکیبؔ کے علاوہ متعدد دوسرے شعرا ہیں جو ناصرؔ کے لہجے میں شعر کہتے ہیں، بلکہ ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنا بنا بنایا لہجہ ترک کر کے ناصرؔ کا لہجہ شعوری طور پر اپنایا ہے مگر مشکل یہ ہے کہ ناصرؔ کا لہجہ اپنانے کے لئے اس کا سا مزاج، زندگی کے بارے میں اس کا سا رویہ بھی تو درکار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس طرح ناصرؔ، میرؔ کے لہجے میں غزل کہنے میں کامیاب رہے، اسی طرح صرف احمد مشتاقؔ ہی ناصرؔ کے لہجے میں غزل کہتے محسوس ہوتے ہیں۔

مگر یہ انفرادی مثالیں تھیں۔ دراصل کسی بڑے شاعر کے اثرات غیر محسوس انداز میں اپنا عمل جاری رکھتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے دھوپ پھولوں میں نفوذ کرتی ہے اور خوشبو ہوا میں تحلیل ہوتی ہے۔ ناصرؔ کی غزل کے اثرات بھی بظاہر اسی طرح غیر محسوس ہیں، مگر جس طرح خوشبو گواہی دیتی ہے کہ کہیں پھول کھلا ہے، اسی طرح جدید اردو غزل میں نرمیاں، اداسیاں، مظاہرِ فطرت سے دلچسپیاں، چڑیاں اور کبوتر، گھاس کی پتیاں اور درختوں کی ٹہنیاں جس

طرح گھر کئے جا رہی ہیں، اور ساتھ ہی عشق کے حوالے سے زندگی کو سمجھنے سمجھانے کی جو ایک لہر چلی ہے، وہ اس حقیقت کی غماز ہے کہ یہ سب شعاعیں اس آفتاب سے پھوٹ رہی ہیں جس کا نام ناصرؔ کاظمی ہے۔ کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے، لیکن جب بھی کوئی نیا شاعر غزل لکھنے بیٹھے گا وہ میرؔ و مصحفیؔ، غالبؔ و مومنؔ، اقبالؔ و فراقؔ اور فیضؔ و ندیمؔ کے علاوہ ناصرؔ کی غزل سے بھی بچ کر نہیں نکل سکے گا۔ پھر ناصرؔ کی غزل میں ان سب بڑے غزل گو شعرا کی خوبیوں کے امتزاج کے علاوہ خود ناصرؔ کے انفرادی اسلوبِ نظر اور اسلوبِ فن کی نشان دہی با آسانی کی جا سکتی ہے، چنانچہ ناصرؔ کے اثرات ہمہ گیر ہیں۔ حد یہ ہے کہ باغی قسم کے نوجوان غزل گوؤں کے ہاں بھی ناصرؔ جگہ جگہ بول اٹھتے ہیں، وجہ اس کی صرف یہ ہے کہ ناصرؔ کی غزل میں جو نرمی اور اُداسی اور ایک باشعور قسم کی سپردگی ہے، وہ اُردو غزل کی بہترین روایات کا نچوڑ ہونے کے علاوہ عصری رویے کی بھی ترجمان ہے۔ یوں نئی نسل کو ناصرؔ سے متعارف ہونے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی اور اسی لئے ناصرؔ جو جدید غزل میں خوشبو کی طرح نفوذ کئے جا رہے ہیں آنے والی نسلوں کی بھی امانت بنتے جا رہے ہیں اور ان کی اس پیش گوئی کی صحت کے ثبوت ابھی سے مہیا ہو رہے ہیں کہ :-

ہر دور کی غزل میں میرا نشاں ملے گا

ناصرؔ کا یہ کارنامہ آئندہ صدیوں تک یادگار رہے گا کہ انہوں نے میرؔ و غالبؔ کی غزل کو، جو دشمنوں کے پے در پے واروں کی تاب نہ لا کر خاک پر تڑپ رہی تھی، آہستہ سے اٹھایا، اُسے جھاڑا پونچھا، اسے بنایا سنوارا اور جب وہ اس محبوب کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر اپنے معاشرے میں داخل ہوئے تو لوگ غزل کے اس نئے انداز سے نکھرے ہوئے حُسن پر ہزار جان سے فریفتہ ہو گئے اس فریفتگی کا ایک ثبوت جدید اُردو غزل ہے جس نے غزل کے امکانات کے اُفق کہیں سے کہیں تک پھیلا دیئے ہیں۔ پاکستان میں تو ناصرؔ مقبول ہیں ہی کہ

ان کی شاعری پاکستان ہی کی پیداوار ہے، مگر ایک عجیب بات یہ ہے کہ ہندوستان کے غزل گوؤں کو تو ناصرؔ نے جیسے فتح کر لیا تھا۔ وہاں فراقؔ کے بعد کوئی فیضؔ اور ندیمؔ نہیں پیدا ہوتے اس لئے ہندوستان کے شعرا نے فراقؔ کے لہجے کی گونج چند خوبصورت اضافوں کے ساتھ ناصرؔ میں محسوس کی اور گزشتہ کئی برس سے وہاں جو غزل کہی جا رہی ہے، وہ سراسر ناصرؔ کے فیضان کی غماز ہے۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ ناصرؔ حدود و ثغور سے بلند ہوتے جا رہے ہیں اور وہ وقت قریب ہے جب انہیں عالمی سطح پر ایک بڑا شاعر تسلیم کر لیا جائے گا۔

کتابیات

۱۔ برگِ نے (مجموعۂ کلام) ناصر کاظمی

۲۔ دیوان (مجموعۂ کلام) ″

۳۔ پہلی بارش (غیر مطبوعہ غزلیں) ″

۴۔ امریکی سوسائٹی (ترجمہ) ″

۵۔ ڈائریاں (غیر مطبوعہ) ″

۶۔ جدید شاعری (تنقیدی مضامین) ڈاکٹر عبادت بریلوی

۷۔ غزل اور مطالعۂ غزل (تنقیدی) مضامین ″

۸۔ روایت کی اہمیت (″ ″) ″

۹۔ غزل اور متغزلین (″ ″) ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

۱۰۔ اردو غزل ڈاکٹر یوسف حسین خاں

۱۱۔ مقدمہ شعر و شاعری الطاف حسین حالی

۱۲۔ اردو ادب آزادی کے بعد ڈاکٹر اعجاز حسین

۱۳۔ اردو ادب (۱۸۵۷ء تا ۱۹۶۶ء) ڈاکٹر سید عبداللہ

۱۴۔ تنقید و احتساب ڈاکٹر وزیر آغا

۱۵۔ ادبی تنقید ڈاکٹر محمد حسن

۱۶۔ تہذیب و تخلیق سجاد باقر رضوی

۱۷۔ اردو غزل کے پچیس سال خلیق ابراہیم

۱۸۔ میزان فیض احمد فیض

۱۹- اندازے	فراق گورکھپوری
۲۰- ۵۳ء کا بہترین ادب	انتخاب ظ۔ انصاری
۲۱- مغربی شعریات	محمد ہادی حسین
۲۲- تعصبات	فتح محمد ملک
۲۳- مثبت قدریں	ڈاکٹر حنیف فوق
۲۴- تنقیدِ شعر	انیس ناگی
۲۵- Literature and Criticism	by Coombs
۲۶- The Appreciation of Poetry	by Murrey
۲۷- کلیاتِ میر	میر تقی میر
۲۸- دیوانِ غالب	اسد اللہ خاں غالب
۲۹- مہتابِ داغ	مرزا داغ دہلوی
۳۰- کلیاتِ اکبر	اکبر الہ آبادی
۳۱- بالِ جبریل	علامہ محمد اقبال
۳۲- بانگِ درا	"
۳۳- کلیاتِ حسرت	حسرت موہانی
۳۴- سرودِ زندگی	اصغر گونڈوی
۳۵- نشاطِ روح	"
۳۶- باقیاتِ فانی	فانی بدایونی
۳۷- آتشِ گل	جگر مراد آبادی
۳۸- شعلۂ طور	"
۳۹- گنجینہ	یاس یگانہ لکھنوی

۴۰۔ شعلۂ ساز — فراقؔ گورکھپوری

۴۱۔ شبنمستان — ایضاً

۴۲۔ جلال و جمال — احمد ندیم قاسمی

۴۳۔ شعلۂ گل — ایضاً

۴۴۔ دشتِ وفا — ایضاً

۴۵۔ نقشِ فریادی — فیضؔ احمد فیضؔ

۴۶۔ دستِ صبا — ایضاً

۴۷۔ عظمتِ آدم — ظہیرؔ کاشمیری

۴۸۔ گجر — قتیلؔ شفائی

۴۹۔ آبِ رواں — ظفرؔ اقبال

۵۰۔ روشنی اے روشنی! — شکیبؔ جلالی

رسائل، اخبار، انٹرویو

۱۔ ادبِ لطیف — سالنامہ ۴۴ء، اپریل مئی ۱۹۵۵ء، نومبر ۱۹۵۵ء، دسمبر ۱۹۶۱ء، اکتوبر ۱۹۶۲ء، نومبر ۱۹۶۲ء، دسمبر ۱۹۶۲ء

۲۔ افکار — ۱۹۶۰ء

۳۔ الشجاع — سالنامہ ۱۹۶۸ء

۴۔ امروز، روزنامہ — ۴ دسمبر ۱۹۶۹ء

۵۔ اوراق — مارچ ۱۹۷۳ء

۶۔ خیابان — خاص نمبر ۴ ۱۹۶ء

۷۔ راوی — اپریل ۱۹۷۲ء

۸۔ ساقی — سالنامہ جنوری فروری ۱۹۵۲ء، شمارہ ۱۹۵۳ء

۹۔ سوغات — جدید نظم نمبر شمارہ ۷۔۸

۱۰۔ سویرا — شمارہ ۱۷۔۱۸، شمارہ ۱۹۔۲۰۔۲۱

۱۱۔ سیپ — سالنامہ، شمارہ ۲

۱۲۔ شاہراہ — فروری ۱۹۵۱ء، دسمبر ۱۹۵۹ء، جون ۱۹۶۰ء

۱۳۔ شاہکار — شمارہ ۱۹۴۷ء

۱۴۔ فنون — غزل نمبر ۱۹۶۹، اپریل مئی ۱۹۷۲ء
جون جولائی ۱۹۷۲ء

۱۵۔ کتاب — ۱۹۷۲ء، اپریل ۱۹۷۴ء

۱۶۔ لفظ — دسمبر ۱۹۷۲ء، جنوری ۱۹۷۴ء،
جنوری ۱۹۷۴ء شمارہ ۶۔۷

۱۷۔ ماحول — مئی ۱۹۵۲ء، اکتوبر نومبر ۱۹۵۲ء

۱۸۔ نقوش — جون ۱۹۶۰ء، شخصیات نمبر ۱۹۴۱ء
جنوری فروری ۱۹۴۲ء

۱۹۔ نگار — سالنامہ ۱۹۶۵ء، سالنامہ ۱۹۶۷ء

۲۰۔ نئی قدریں — فکرِ جدید نمبر نومبر ۱۹۶۶ء، شاعر نمبر
شمارہ ۴، ۱۹۶۷ء

۲۱۔ نیا دور — شمارہ ۷۔۸

۲۲۔ نیرنگِ خیال — غزل نمبر ۱۹۶۹ء

۲۳۔ ہمایوں — اکتوبر ۱۹۵۵ء

ٹی وی انٹرویو ——— ناصر کاظمی فروری ۱۹۷۲ء
انٹرویو لینے والے ——— انتظار حسین

ناصر کاظمی شخصیت اور فن

زیرِ نظر کتاب ناصر کاظمی پر لکھی جانے والی پہلی کتاب ہے البتہ شائع ہونے کے لحاظ سے اس کا نمبر چوتھا ہے۔ اس میں ناصر کی زندگی اور شاعری کا تفصیلی تجزیہ کیا گیا ہے۔ ناصر کی شاعری کے بارے میں جو نقطۂ نظر ناہید قاسمی نے پیش کیا ہے، اُس پر ممکن ہے کچھ لوگ کہیں کہ ایک ترقی پسند شاعر اور ادیب کی بیٹی کا یہی نقطۂ نظر ہو سکتا تھا۔ لیکن میں یہ کہوں گا کہ جو باتیں ناصر کی شاعری میں ناہید نے دیکھیں وہ ایک ترقی پسند مصنف کی بیٹی یا شاگرد ہی کو نظر آ سکتی تھیں۔ ناہید اپنی رائے کے اظہار میں اگرچہ بہت Assertive ہیں لیکن دوسروں کی آرا کے ساتھ بے انصافی نہیں کرتیں، اُن کا تجزیہ کرتی ہیں اور پھر اپنی بات دلائل کے ساتھ قارئین کے سامنے رکھتی ہیں اور حتمی فیصلہ اُن پر چھوڑ دیتی ہیں۔

اور ایک بات جو اس کتاب کے علاوہ کسی بھی کتاب یا مضمون میں نہیں ملے گی، وہ ہے ناصر کاظمی کی نظم و نثر پر سیر حاصل تبصرہ۔ چونکہ یہ کتاب ابتدائی طور پر ایک تحقیقی مقالہ کی صورت میں لکھی گئی اور اس وقت ناصر کا مکمل کلام اور نثری تحریریں کتابی شکل میں منظرِ عام پر نہیں آئی تھیں، اس لیے ناہید کا یہ خیال درست ہے کہ ناصر پر مستقبل میں چاہے جو کچھ بھی لکھا جائے لیکن اس موضوع پر "حرفِ آغاز" کا اعزاز اُنہی کے حصے میں آیا۔

باصر سلطان کاظمی